
ان دیکھی دنیا

اَن دیکھی دُنیا

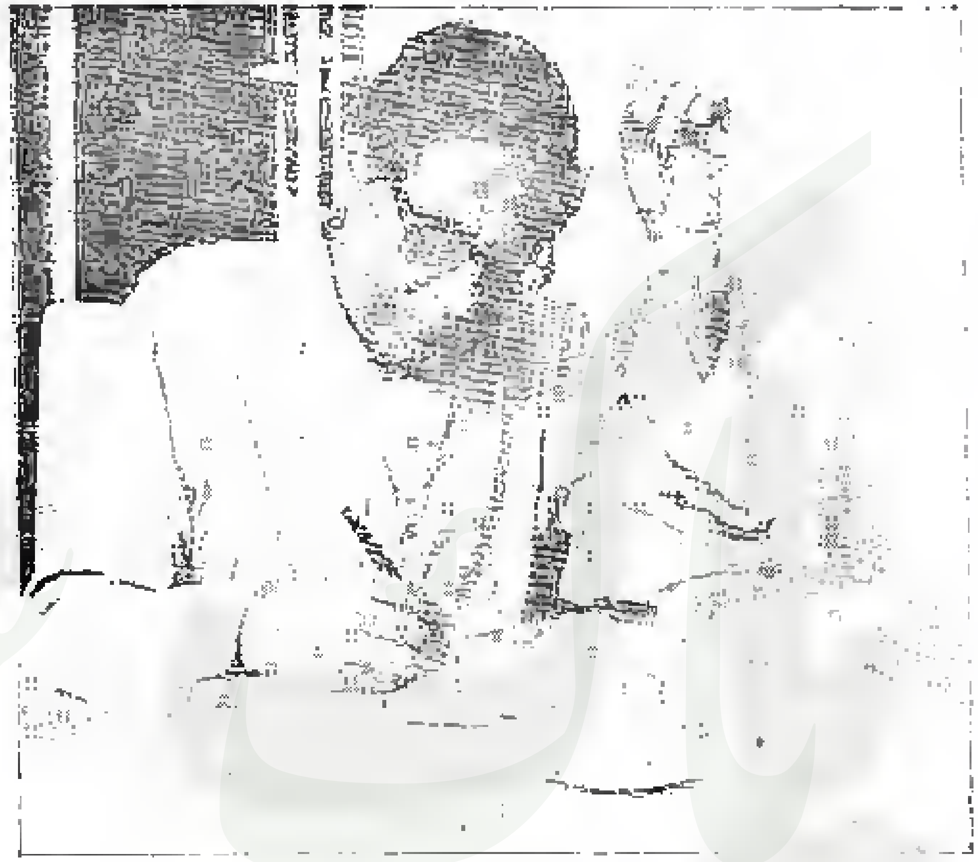
لڑکے اور لڑکیوں کے لیے
ایک دِل چسپ ناول

سر آرتھر کونن ڈائل

ترجمہ: سعید رضا سعید

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ۔ راولپنڈی ۔ منگلا ۔ پشاور ۔ حیدرآباد ۔ کراچی



سعید رضا سعید

شرط یہ ہے کہ.....

مسٹر ہنگرٹن لندن کے ایک بہت بڑے بینک کے ڈائریکٹر تھے میں اُن کی لڑکی گلیڈی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے اور میں ہفتے میں دو تین بار ضرور اُن کے گھر جاتا تھا۔ ایک دن میں مسٹر ہنگرٹن کے گھر گیا تو وہ سُوٹ پہنے کھڑے تھے۔ معلوم ہُوا کہ آج بینک کے ڈائریکٹروں کی میٹنگ ہے اور وہ وہیں جا رہے ہیں۔ اُنھوں نے دو چار منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر اُٹھ کر چلے گئے۔

اگر میں ادیب یا شاعر ہوتا تو گلیڈی کی تعریف کا حق ادا کر سکتا لیکن بدقسمتی سے میں اخباری رپورٹر ہُوں اِس لیے اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ بہت خوب صُورت اور نیک لڑکی تھی۔

وہ ایک سُرخ پردے کے پاس بیٹھی تھی۔ ہم دونوں بڑی دیر تک خاموش رہے۔ آخر اُس نے کچھ جھجکتے ہُوئے کہا: "آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ میرے ابّا جان آپ کو پسند کرتے ہیں لیکن ——"

پہلی بار ——— 1969ء
تعداد ——— 2000
قیمت ———

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ — لاہور ● باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

"لیکن کیا؟" میں نے پوچھا۔

گلیڈی بولی "میں نے ایک ایسے شخص سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو کوئی بہت بڑا کارنامہ کرے۔ ایک ایسا کارنامہ جو اُسے ساری دُنیا میں مشہور کر دے۔"

گلیڈی کے یہ ارادے سُن کر میں سوچ میں پڑ گیا۔ وہ بولی "آپ چاہے اِسے میرا بچپنا کہہ لیں یا پاگل پن۔ مگر ہے یہ حقیقت۔"

"اچھا، اگر مجھے موقع ملا تو۔"

"موقع ملا نہیں کرتا۔ تلاش کیا جاتا ہے اور اب خدا حافظ۔ آپ کو دفتر جانا ہے۔"

میں باہر نکل کر پہلے تو اُلو کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور پھر ٹرام میں بیٹھ کر اخبار "ڈیلی گزٹ" کے دفتر کی طرف چل دیا۔ اسی اخبار میں میں کام کرتا تھا۔

جیسے ہی میں دفتر میں داخل ہوا اخبار کے ایڈیٹر میکارڈل نے مجھے بلایا اور بیٹھنے کا اِشارہ کرتے ہوئے بولا "میں تمہارے کام سے خوش ہوں میلون۔ خاص کر کوئلے کی کان والے حادثے کی رپورٹ تو بہت اچھی تھی۔"

اُسے خوش پا کر میں نے کہا "جناب، آپ مجھ پر ایک عنایت کریں۔"

"وہ کیا؟" اُس نے عینک کے اوپر سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کسی بڑے اہم کام پر بھیج دیں۔ کسی ایسی مہم پر جہاں کامیابی مشکل ہو۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا۔

یہ سُن کر ایڈیٹر مسکرایا اور بولا "میاں، وہ زمانے گئے جب اِس قسم کی مہمیں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو دُنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اِنسان کا قدم نہ پہنچ گیا ہو ___ مجھے افسوس ہے کہ تم دیر میں پیدا ہوئے۔ ساری مہمیں پہلے ہی سر کر لی گئی ہیں۔"

یہ سُن کر مایوسی سے میرا مُنہ لٹک گیا۔ لیکن جب میں اُٹھنے لگا تو اُس نے کہا "سُنو ___" میں پھر بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا۔ "تمھیں مشکل کام کرنے کا شوق ہے تو لو مبارک۔ جاؤ اور مسٹر چیلنجر" کا انٹرویو لینے کی کوشش کرو۔"

میں نے پروفیسر چیلنجر کا نام سُنا تھا۔ وہ ایک مشہور ماہر حیوانیات تھے اور بڑے بد دماغ مشہور تھے۔ ایک اخبار کے رپورٹر کا تو اُنھوں نے سر ہی پھوڑ دیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ایڈیٹر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "جاؤ گے نا۔"

"جی چلا جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ اس کے بعد ایڈیٹر نے ایک موٹے سے فائل میں سے پروفیسر چیلنجر کے بارے میں ضروری معلومات نکال کر مجھے دیں اور بولا "بس یہی کام ہے اس کو

کرو دکھاؤ تو بہت ہے۔"

میں کاغذات لے کر اپنے کمرے میں چلا آیا اور اُن پر نظر ڈالی تو پتا چلا کہ دو سال ہوئے پروفیسر چے لنجر تنہا جنوبی امریکہ کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں سے لوٹ کر انھوں نے ایک پریس کانفرنس بلائی اور اپنے واقعات سنانے لگے۔ کچھ رپورٹروں نے اُن سے کچھ سوالات کیے تو وہ چڑ گئے اور اس کے بعد سے چپ سادھ لی۔ کئی رپورٹروں نے اُن کی زبان کھلوانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔

دفتر سے نکل کر میں کافی پینے پریس کلب چلا گیا۔ وہاں رسالہ "نیچر" کا ایک ایڈیٹر ہنری بیٹھا تھا۔ میں اُسی کی میز پر جا بیٹھا اور باتوں باتوں میں پوچھا۔

"یہ بتاؤ۔ یہ پروفیسر چے لنجر کیسے آدمی ہیں؟"

ہنری نے مجھے اُوپر سے نیچے تک گھور کر دیکھا اور بولا "ابھی اُن کے سفر کی بے سر و پا کہانی پر کسی نے یقین نہیں کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے عجیب و غریب جانور دیکھے ہیں۔ اُن کے بہت دھندلے فوٹو بھی دکھاتے ہیں مگر فوٹو تو جعلی بھی ہو سکتے ہیں۔"

"اُن کی پوری کہانی بھی کسی نے سنی؟" میں نے پوچھا جس پر ہنری نے جواب دیا۔

"سنتے کیسے؟ بات کرو تو وہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں —

بچارے ویڈلی کا قصہ تو سنا ہی ہوگا تم نے؟"

"وہ کیا؟" میں نے دل چسپی سے پوچھا۔

"ادارۂ حیوانیات کے ایک رکن ویڈلی نے انھیں اس مضمون کا رقعہ بھیجا کہ ادارۂ حیوانیات کے صدر کی خواہش ہے کہ پروفیسر چے لنجر ادارے کے ایک جلسے میں شرکت کر کے ہم سب کو شکر گزار ہونے کا موقع دیں۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"پروفیسر چے لنجر نے اس کا جواب یہ دیا کہ ادارۂ حیوانیات کے صدر جہنم رسید ہو کر پروفیسر چے لنجر کو شکر گزار ہونے کا موقع دیں۔"

یہ کہہ کر ہنری ہنسنے لگا۔ مجھے بھی ہنسی آگئی۔ واقعی پروفیسر چے لنجر سے نمٹنا تو ایک چیلنج تھا۔

ہنری مجھے اپنے دفتر لے گیا اور کافی تلاش کے بعد ایک پرانا رسالہ نکالا جس میں پروفیسر چے لنجر کا وہ مضمون شائع ہوا تھا جو شہر ویانا میں حیوانیات کے ماہروں کی کانفرنس میں پڑھا گیا تھا اور اس پر کافی ہنگامہ ہوا تھا۔

میں نے مضمون پڑھا۔ سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ پروفیسر نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی خوب دھجیاں بکھیری تھیں۔ اچانک مجھے ایک بات سوجھی۔ میں نے ہنری سے کاغذ مانگ کر پروفیسر کے نام ایک خط لکھا۔

محترمی پروفیسر چیلنجر۔ آداب عرض
میں حیوانیات کا ایک طالب علم ہوں۔ آج آپ کا اس موضوع پر ایک مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ لیکن کئی بار پڑھنے کے باوجود چند باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ سے ملاقات کر کے اپنے علم میں اضافہ کروں۔ پرسوں (بدھ) کی صبح کو میں گیارہ بجے حاضر ہو کر آپ سے نیاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو۔

آپ کا عقیدت مند

ایڈورڈ میلون

پھر میں نے یہ خط ہنری کو دکھا کر پوچھا "کیسی رہی؟"
"جواب نہیں" اس نے میری پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

نک چڑھا پروفیسر

بدھ کی صبح کو میں ہنری کے پاس پہنچا تو اس نے مجھے ایک خط دیا۔ میرا نام اور پتا ایک ایسی تحریر میں تھا جو خاردار تار سے ملتی جلتی تھی۔ میں نے جلدی سے خط کھولا لکھا تھا۔

جناب آپ کا خط ملا۔ آپ کی طرح بہت سے لوگ علم حیوانیات کے طالب علم ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر سب نالائق ہیں۔ میں آپ کو کوئی بات تو بتا سکتا ہوں لیکن اسے سمجھنے کے لیے دماغ نہیں دے سکتا۔ بہرحال آپ آئیے ـــــ اور ہاں پھاٹک پر میرے ملازم آسٹن کو میرا یہ لفافہ دکھا دیجیے گا۔ تب ہی وہ اندر آنے دے گا۔ میں نے اسے ہدایت کر رکھی ہے کہ ایسے کسی گدھے کو اندر نہ گھسنے دے جو اپنے آپ کو اخباری رپورٹر کہتا ہو۔

آپ کا مخلص

جارج ایڈورڈ چیلنجر

ہنری خط دیکھ کر کہنے لگا۔ جاننے سے پہلے اپنی ماں سے دودھ

بنجوالینا۔"

"تم فکر نہ کرو۔" میں نے جواب دیا اور گھڑی دیکھ کر پروفیسر چیلنجر کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھاٹک پر آسٹن شکاری کتے کی طرح سینہ پھلائے کھڑا تھا۔ میں نے اُسے لفافہ دکھایا تو اُس نے مجھے اندر جانے دیا۔

اندر پہنچ کر ایک دُبلی پتلی خاتون ملیں۔ اُنھوں نے مجھے روک کر پوچھا: "کیا آپ میرے شوہر سے پہلے بھی کبھی ملے ہیں؟"

"جی نہیں۔ یہ پہلا موقع ہے۔"

"تو ذرا ہوشیار رہیے گا۔ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔"

بیگم چیلنجر کے یہ الفاظ سُن کر میں نے اُن کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سنجیدہ تھیں۔ بہرحال اِس اِطلاع پر میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولیں۔

"ان کی ہر بات مان لینا۔ بحث مت کرنا۔ پھر بھی اگر معاملہ بے قابو ہو جائے تو گھنٹی کا بٹن دبا دینا۔ میں آ جاؤں گی۔ دُنیا میں میرے سوا کوئی اُنھیں قابو میں نہیں کر سکتا۔"

ان ہدایات کے ساتھ اُنھوں نے دروازہ کھول کر مجھے پروفیسر کے کمرے میں بھیج دیا۔ وہ ایک چوڑی میز کے دُوسری طرف گھومنے والی کرسی پر بیٹھے تھے۔ میز پر کتابوں اور نقشوں کا انبار لگا تھا۔ ایک گلوب بھی رکھا ہوا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی کرسی گھوم

اور پروفیسر کا چہرہ میری جانب ہو گیا۔ مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ کسی عجیب آدمی سے پالا پڑے گا۔ مگر اُف میرے خدا، ایسے آدمی کا تو تصوّر ہی نہ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے اتنا بڑا سر اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا اور بے ترتیب ڈاڑھی کے نیچے چھپا ہوا چہرہ اور موٹی گردن مونٹ جوڈارو کے بیل کی یاد دلاتی تھی۔ سینہ اور پیٹ کسی بڑے پیپے کی طرح تھا۔ بازوؤں پر مگدر دل کا دھوکا ہوتا تھا۔ کلائیاں بہت موٹی اور بے ہنگم سی تھیں جن پر ریچھ کے سے بال تھے اور جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئے تو بالکل یہی محسوس ہوا جیسے کوئی سانڈ ڈکرا رہا ہو۔

"ہُوں، تو آپ ہیں علمِ حیوانیات کے وہ طالبِ علم؟" یہ کہتے ہوئے اُنھوں نے میز پر سے میرا خط اُٹھایا اور اُسے دیکھتے ہوئے بولے۔

"میرے مضمون کی چند باتیں آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں — یعنی باقی باتیں آپ سمجھ گئے، کیوں؟"

میں گھبرایا کہ اگر یہ پوچھ بیٹھے کہ کیا سمجھے تو سارا پول کھل جائے گا۔ میں نے بات بدلنے کے لیے کہا۔ "دُنیا میں ان لوگوں نے تو آپ کے ساتھ بڑی زیادتی کی۔"

"میاں، میں اپنے ساتھ زیادتی کرنے والوں سے خود نمٹ سکتا ہوں۔ تمھاری ہمدردی کی ضرورت نہیں ہے۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اچھا، وقت برباد مت کرو۔ جلدی پوچھو کیا پوچھنا ہے؟"

"میرا مطلب تھا کہ آج کل کے سائنس دان ——"

"گھاس کاٹتے ہیں آج کل کے سائنس دان۔" انھوں نے میری بات کاٹ کر کہا۔

"دیکھیے نا ڈارون نے کہا تھا ——"

"جاہل تھا ڈارون۔"

"ارتقا کے بارے میں آپ کا نظریہ مختلف ہے؟"

"بالکل —— میرا نظریہ یہ ہے کہ ارتقا کی رفتار ہر جگہ ایک سی نہیں رہی ہے۔"

"اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لندن میں تم سے بڑا دھوکے باز کوئی نہیں۔ تم ایک حقیر کیڑے ہو اور اپنے آپ کو اخبار نویس کہتے ہو۔ نہ تمھیں سائنس آتی ہے اور نہ آداب۔"

اتنا کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ غصّے کے مارے ان کی آنکھیں اُبلی پڑ رہی تھیں۔

"دیکھیے جناب آپ کو میری توہین کرنے کا حق نہیں ہے۔" میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"کم بخت —— حق کے بچے۔ ٹھہر تو سہی۔" یہ کہتے ہوئے وہ میری

جھپٹے۔ یوں تو میرا وزن بھی دو من سے اُوپر تھا اور فٹ بال کا بہت اچھا کھلاڑی تھا لیکن پروفیسر تو ایک گینڈے کی طرح تھے۔ وہ آتے ہی مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے اپنے بچاؤ کی بڑی کوشش کی لیکن وہ مجھے دھکیلتے ہوئے زینے کی طرف لے چلے اور پھر ہم دونوں لڑھکتے ہوئے نیچے گر پڑے۔

یہ زینہ مکان کے باہر کی طرف نکلتا تھا۔ میری خوش قسمتی سے ایک پولیس کا انسپکٹر اُدھر سے گزر رہا تھا۔ وہ ٹھہر گیا اور بولا۔

"یہ کیا حرکت ہے؟ پروفیسر صاحب پچھلے دو مہینے میں تین مرتبہ آپ کے خلاف مار پیٹ کی رپورٹیں آ چکی ہیں۔ آپ کی شہرت کی وجہ سے ہم نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن اب حد ہو گئی ہے۔ چلیے میرے ساتھ تھانے۔"

"نہیں جناب، یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ غلطی میری ہی تھی۔" میں نے کہا۔

میری اس بات پر پولیس افسر کو تعجب ہوا اور پروفیسر تو ہکا بکا رہ گئے۔ جب پولیس افسر بڑبڑاتا ہوا چلا گیا تو پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔

"میرے ساتھ اُوپر آؤ —— نالائق کہیں کے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب سیڑھیاں چڑھنے لگے اور میں بھی لنگڑاتا، کمر سہلاتا ان کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

اوپر پہنچ کر تو پروفیسر کی شامت ہی آ گئی۔ اُن کی دُبلی پتلی بیوی دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اُن پر برس رہی تھی۔

"وحشی کہیں کے۔ اِس شریف آدمی کے ساتھ ایسا ذلیل برتاؤ؟ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پھر وہ خاتون مجھ سے بولیں "معاف کیجیے گا۔ اگر میں پہلے آ جاتی تو یہ نوبت نہ آتی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے مسکرا کر کہا مگر وہ شریف عورت اپنے شوہر کو معاف کرنے کو تیار نہ تھی۔

"تم سارے محلے میں مشہور ہو چکے ہو۔ میں تو شرم کے مارے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔"

پروفیسر چیلنجر اس طرح ہنسے جیسے بیوی کی باتوں میں انھیں لطف آ رہا ہو۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی بیوی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر سنگ مرمر کی کارنس پر بٹھا دیا جو زمین سے کوئی سات فٹ اونچی تھی۔

"ارے میں گر پڑوں گی۔ اتارو مجھے۔" وہ بیچاری بُری طرح چیخ رہی تھی۔ پروفیسر مسکرائے اور بولے۔

"ایسے نہیں۔ یوں کہو ــــ اے دُنیا کے عظیم ترین پروفیسر مجھے نیچے اتار لیجیے۔"

"اچھا یہ لو۔ اے دُنیا کے عظیم ترین پروفیسر مجھے نیچے اتار لیجیے"

بیوی نے دانت بھینچ کر بڑی مشکل سے یہ لفظ ادا کیے اور پروفیسر نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اُسے زمین پر اتار دیا۔ وہ بچاری شرمندہ سی ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"آپ واقعی عجیب و غریب آدمی ہیں۔" میں نے کہا جس پر پروفیسر نے ایک قہقہہ لگایا اور دروازہ بند کرنے کے بعد مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پروفیسر اپنی کرسی پر جا بیٹھے اور میز کی دراز سے سگار کا بکس نکال کر میری طرف بڑھایا۔ میں نے سگار لے کر سُلگایا تو پروفیسر کہنے لگے۔

"اس ذلیل پولیس والے کے سامنے تم نے جو کچھ کہا اس سے مجھے احساس ہوا کہ اگرچہ تم بھی عام لوگوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہو مگر ہو شریف آدمی۔"

"شکریہ" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اب میں تمھیں اپنے جنوبی امریکہ کے حیرت انگیز سفر کے بارے میں بتاؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ میری بات مت کاٹنا۔ اور یہ باتیں میری اجازت کے بغیر نہ تم اخبار میں شائع کرو گے اور نہ کسی کو بتاؤ گے۔"

انکار کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ مجھے وعدہ کرنا پڑا۔

"اپنی عزت کی قسم کھاؤ۔"

"میں اپنی عزت کی قسم کھاتا ہوں۔"

"لیکن مجھے کیا معلوم کہ تم عزت دار ہو بھی۔"

"پروفیسر!" میں چیخ پڑا۔ "زندگی میں آج تک کسی نے میری اتنی بے عزتی نہیں کی۔"

پروفیسر میرے بگڑنے سے خفا نہیں ہوئے بلکہ مسکراتے ہوئے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگے۔

"ہوں — گول سر — بھوری آنکھیں — سیاہ بال جو ہلکے خم دار ہیں — تمہارا تعلق کلٹک نسل سے معلوم ہوتا ہے۔"

"میں آئرلینڈ کا رہنے والا ہوں۔"

"تب ٹھیک ہے۔" پروفیسر نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہنا شروع کیا۔

"تمھیں شاید معلوم ہو کہ کوئی دو سال ہوئے میں نے جنوبی امریکہ کا سفر کیا تھا۔ تمھارے سائنس دانوں نے وہاں کے جانوروں کے بارے میں جو دلیلیں دی ہیں میں انھیں نہیں مانتا۔ اس لیے میرا ارادہ تھا کہ ان کی تحقیقات کو جھٹلا کر اصل حقیقت دنیا کے سامنے پیش کردوں۔"

"تمھیں معلوم ہے کہ دریائے ایمیزن کے اطراف کے کچھ علاقوں میں آج تک کوئی نہیں گیا اور اس دریا کے کچھ معاون دریاؤں کے راستوں کی کھوج کسی نے نہیں کی۔ میں چند ایسے ہی علاقوں میں گیا ہوں اور علم حیوانات کے بارے میں اتنی معلومات حاصل کرلی ہیں

ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ واپسی پر میں مقامی باشندوں کی ایک چھوٹی سی بستی میں بھی ٹھہرا جو اس جگہ واقع ہے جہاں ایک ندی دریائے ایمزن میں گرتی ہے۔ اس جگہ کا نام میں نہیں بتاؤں گا۔

اس گاؤں کے کچھ لوگ سفر میں میرے ساتھ تھے۔ راستے میں کوئی بیمار پڑتا تو میں اسے دوا دیا کرتا۔ اس سے وہ مجھے کوئی بڑا ڈاکٹر سمجھنے لگے تھے۔ واپسی پر انھوں نے مجھے اشاروں سے سمجھایا کہ میں چل کر ایک مریض کو دیکھ لوں۔ جب میں ان کے سردار کے ساتھ اس کی جھونپڑی میں پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ مریض کوئی مقامی باشندہ نہیں بلکہ گوری نسل کا ایک آدمی ہے۔ اس کا لباس پھٹا ہوا تھا اور چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بڑی سختیاں جھیلی ہیں۔ گاؤں والوں نے بتایا کہ جنگل سے وہ اکیلا ہی یہاں پہنچا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ میں نے نبض دیکھی تو پتا چلا کہ وہ مر چکا ہے۔

اس آدمی کا تھیلا بھی وہیں پڑا تھا۔ اس کا جائزہ لینے پر ایک تختی ملی جس پر اس کا نام اور پتا لکھا تھا۔ میپل وہائیٹ۔ لیک ایوینیو، ڈیٹرائیٹ مشیگن۔ وہ شاعر تھا اور آرٹسٹ بھی۔ تھیلے میں اس کی کچھ نظمیں اور تصویریں بنانے کے سامان کے علاوہ یہ ہڈی بھی تھی جو میری میز پر رکھی ہوئی ہے۔ تھیلے میں تتلیوں کے بارے میں ایک کتاب، ایک ریوالور اور کچھ کارتوس بھی تھے۔

میں وہاں سے واپس ہو ہی رہا تھا کہ میری نظر اُس کی پھٹی ہوئی جیکٹ پر پڑی۔ اُس کی جیب میں ایک کاپی رکھی ہوئی تھی۔ یہ اُس کی خاکے بنانے کی کاپی تھی جو اُس وقت بھی ایسی ہی بوسیدہ اور پھٹی ہوئی تھی جیسی اب ہے۔ تم اِس کا ایک ایک صفحہ دیکھو۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے کاپی مجھے دے دی اور خود سگار سلگا لیا۔

میں نے کاپی کو کھولا۔ میرا خیال تھا اِس میں کوئی چونکا دینے والی بات ہو گی لیکن پہلے صفحے پر ایک موٹے سے آدمی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کے بعد کئی صفحات پر مقامی لوگوں اور اُن کے رہنے سہنے کے بارے میں خاکے سے تھے۔ کچھ عورتوں اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ ایک جگہ کچھوے کو انڈوں کے پاس دکھایا گیا تھا ایک صفحے پر مگرمچھ بنے ہوئے تھے۔

"یہ مگرمچھ ہیں؟" میں نے کہا۔

"اسے ناکا کہتے ہیں۔ مگرمچھ جنوبی امریکہ میں نہیں ہوتا۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ ___"

میں نے یہ سوچ کر کہ پروفیسر تقریر نہ شروع کر دے جلدی سے بات کاٹ کر کہا۔ "مگر ان تصویروں میں تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔"

"ذرا صفحے تو اُلٹو۔" پروفیسر نے مسکرا کر کہا۔

میں نے صفحہ اُلٹا۔ یہ ایک منظر کی تصویر تھی۔ زردی مائل سبز زمین پر کچھ پودے تھے۔ آگے جا کر زمین اُوپر کی طرف اُٹھتی ہوئی چقماق کی چٹانوں سے مل جاتی تھی۔ ان چٹانوں کی دیوار سے ذرا ہٹ کر اُتنی ہی بلند ایک مخروطی چٹان تھی جس پر ایک اُونچا اور مضبوط درخت تھا۔ چٹانوں کی دیوار کے اُوپر درختوں کی سبزی جھلک رہی تھی۔ اس کے اُوپر نیلا آسمان تھا۔ اگلے صفحے پر پھر یہی منظر تھا مگر اس مرتبہ چقماق کی دیوار نما چٹان کے قریب جا کر خاکہ بنایا گیا تھا۔

"اب کیا کہتے ہو؟" پروفیسر نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ ایک حیرت انگیز منظر ہے۔"

"حیرت انگیز ہی نہیں، اپنی قسم کا انوکھا اور لاجواب منظر۔ اب ذرا اگلا صفحہ دیکھو۔"

میں نے صفحہ اُلٹا تو اس پر ایک عجیب و غریب جانور کی تصویر نظر آئی۔ میرے خیال میں ایسا جانور کسی افیمی کے تصور ہی میں آ سکتا تھا۔ اس کا سر کسی پرندے کی طرح تھا۔ جسم ایک بہت بڑی چھپکلی کا سا اور لمبی سی دُم چوڑے چاقو کے پھل کی طرح تھی۔ اس جانور کے سامنے ایک آدمی خوف زدہ کھڑا تھا۔

"کیا خیال ہے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"عجیب جانور ہے۔"

"لیکن اس نے یہ جانور کیوں بنایا؟"

"دیوانہ ہو گیا ہو گا۔"

"ہاہا۔ تم بس یہیں تک پہنچ سکتے ہو۔"

"اور آپ کا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ جانور حقیقی ہے اور اس کے سامنے بیٹھ کر یہ تصویر بنائی گئی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ اگر یہ تصویر اصل ہے تو یہ آدمی تو بونا معلوم ہوتا ہے اور بونی نسل کے لوگ صرف افریقہ ہی میں پائے جاتے ہیں۔"

"یہ آدمی بونا نہیں ہے۔" پروفیسر نے کہا۔ جانور کی پشت پر پام کا جو درخت ہے اس کی اونچائی پچاس ساٹھ فٹ ہوتی ہے اس سے اندازہ لگا لو۔ اس آدمی کا قد سوا پانچ فٹ کے لگ بھگ ہے۔"

"پھر یہ جانور اتنا بڑا ہوا کہ پورے چڑیا گھر میں بھی شاید ہی آ سکے۔"

پروفیسر چیلنجر نے الماری میں سے ایک موٹی سی کتاب نکالی اور صفحے الٹ پلٹ کر کے ایک تصویر مجھے دکھائی۔ یہ فرضی تصویر ایک ڈینو سار کی تھی یعنی اُس دیو جیسے خوفناک جانور کی جو اب ناپید ہے۔ کتاب میں لکھا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ موجود

آدمی کی اونچائی سے دوگنی ہوتی تھی۔ یہ تصویر اور امریکی آرٹسٹ کا خاکہ آپس میں بہت ملتے جلتے تھے۔ پھر بھی میرا دل اس پر یقین کرنے کو ہرگز تیار نہ تھا کہ ایسا جانور اب بھی موجود ہے۔ میں نے کہا۔

"ہو سکتا ہے اس آرٹسٹ نے یہ تصویر دیکھی ہو اور پھر حافظے کی مدد سے اسے بنا لیا ہو۔"

"اچھا تو یہ ہڈی دیکھو۔" پروفیسر نے وہ ہڈی میز پر سے اٹھا کر میرے ہاتھ میں دے دی۔ یہ کوئی چھ انچ لمبی اور انگوٹھے سے کچھ موٹی تھی۔ پروفیسر نے پوچھا۔

"تمھارے خیال میں یہ ہڈی کس کی ہو سکتی ہے؟"

"میرے خیال میں تو یہ کسی لمبے چوڑے انسان کی ہنسلی کی ہڈی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہنسلی کی ہڈی میں خم ہوتا ہے۔ یہ سیدھی ہے۔ پھر اس پر یہ جو نشان ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ ایک نس بھی اس سے ہل کر گزر رہی تھی۔"

"پھر مجھے نہیں معلوم یہ کیسی ہڈی ہے؟" میں نے کہا۔ اس پر پروفیسر نے ایک ڈبا کھول کر چنے کے برابر ایک ہڈی نکال کر دکھائی اور بولے۔ "یہ ہڈی انسان کی ہے۔ اسی قسم کی ہڈی یہ بھی ہے۔"

"پھر یہ کسی ہاتھی کی ہو گی۔" میں نے جلدی سے کہا جس کے

جواب میں پروفیسر نے کہا۔

"جنوبی امریکہ میں ہاتھی نہیں ہوتا۔"

"تو کوئی دوسرا جانور ہوگا۔"

"یہ کسی ایسے جانور کی ہڈی نہیں ہے جو آج موجود ہو بلکہ کسی بہت بڑے، بہت طاقت ور اور بہت خوفناک قسم کے جانور کی ہے۔"

"یہ تو بڑی دل چسپ بات ہے۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو میں تم سے مایوس نہیں ہوں کہ تمھیں اس سے دل چسپی ہے ـــــ ہاں تو یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد میں جہاں میں کیسے بغیر واپس کیسے آتا، رہنمائی کے لیے مجھے مقامی لوگوں کی مدد درکار تھی۔ تمھیں معلوم ہے اس علاقے کے لوگوں میں ایک نام بہت مشہور ہے۔ کورو پوری۔"

"کورو پوری ـــ میں نے تو یہ نام کبھی نہیں سنا۔"

"کورو پوری سے مراد ہے جنگل کی روح۔ ایک ایسی چیز جس سے ڈرنا چاہیے کسی نے اُس کی شکل نہیں دیکھی لیکن سب اس سے ڈرتے ہیں اور ایمزن کے آس پاس کے سارے قبائلی جانتے ہیں کہ کورو پوری کہاں رہتی ہے۔ میں نے سوچا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہئیں۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

کورو پوری کا نام سنتے ہی لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ اس کے باوجود میں نے دو آدمیوں کو تیار کر لیا اور ایک لمبا سفر کرنے کے بعد، جس کی سمت میں نہیں بتاؤں گا، ہم ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں مرحوم میپل وہائیٹ سے پہلے کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے ہوں گے۔ ذرا اسے دیکھو۔"

یہ کہہ کر پروفیسر چیلنجر نے مجھے ایک فوٹو دیکھنے کو دیا جو دھندلا سا تھا۔ پروفیسر کہنے لگے۔ "واپسی پر ایک حادثے میں ہماری کشتی ڈوب گئی اور کھینچی ہوئی فلموں کا صندوق پانی میں گر پڑا جس سے ساری فلمیں خراب ہو گئیں۔"

میں نے غور سے تصویر کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی منظر تھا جو میپل وہائیٹ کی خاکوں کی کتاب میں تھا۔ پھر پروفیسر نے ایک تصویر دکھائی جو قریب کی تھی۔ اس میں سطح مرتفع کے قریب والی مخروطی پہاڑی اور اس پر ایک اونچا مضبوط درخت صاف نظر آ رہا تھا۔

"درخت پر دکھائی دیا کچھ؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"کوئی چڑیا ہے۔" میں نے غور سے دیکھتے ہوئے بتایا۔ پروفیسر نے ایک محدب شیشہ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس پرندے کے ایک لمبی سی چونچ تھی۔ پروفیسر نے بتایا کہ ان کے پاس اور بھی ثبوت تھے لیکن کشتی کے اس

حادثے کا شکار ہوا ہو ساری چیزیں ضائع ہو گئیں۔ صرف ایک چیز بچی ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے دراز میں سے کوئی دو فٹ کی خمدار ہڈی نکالی جس میں جھلی لگی تھی۔

"یہ شاید کسی بہت بڑی چمگادڑ کا بازو ہے۔" میں نے کہا

"کیا فضول بک رہے ہو۔" پروفیسر نے غصے سے کہا اور پھر وہ چڑیا کے بازو اور چمگادڑ کے پنجوں کے بارے میں بتانے لگے۔

"پھر یہ کون سا پرندہ ہو سکتا ہے۔" میں نے عاجز آ کر کہا۔ جواب میں پروفیسر نے پھر وہی کتاب نکالی اور ایک دیو نما چڑیا کی تصویر دکھائی جو کسی زمانے میں رہی ہوگی۔ تصویر کے نیچے اس کا نام "پیروڈکٹائل" لکھا تھا۔ دوسرے صفحے پر اس کے پروں اور بازوؤں کی ہڈیوں کا پنجر دکھایا گیا تھا۔ پروفیسر نے ایک ہڈی پر انگلی رکھ کر کہا۔

"دیکھو، یہ ایسی ہی ہڈی ہے نا؟"

آپ یقین کیجیے، خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ ہڈی اور تصویر دونوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ چڑیا کسی ہوائی جہاز سے چھوٹی نہ ہوگی۔ میرے دل میں اچانک پروفیسر کے لیے عزت کا جذبہ پیدا ہوا۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔

"پروفیسر صاحب، آپ واقعی سائنس کے کولمبس ہیں۔ آپ نے ایک نئی دنیا تلاش کر لی ہے۔"

پروفیسر مسکرا دیے اور پھر انھوں نے اپنا قصہ دوبارہ شروع کیا۔ "ہاں تو مسٹر میلون۔ ہوا یہ کہ برسات شروع ہو گئی۔ میرے پاس خوراک ختم ہونے لگی۔ میں اس بڑی سطح مرتفع کے دامن تک تو پہنچ گیا۔ لیکن اوپر چڑھنے کا راستہ نہیں ملا۔ اس کے پاس جو گاؤدم پہاڑی تھی اس پر چڑھنا نسبتاً آسان تھا۔ میں صرف آدھی دور چڑھ سکا۔ وہاں سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ سطح مرتفع بہت وسیع ہے اور اس پر ایک گھنا جنگل ہے۔"

"کیا آپ نے وہاں زندگی کے کچھ اور بھی آثار پائے؟"

"نہیں۔ لیکن اس امریکی نے جو جانور بنایا ہے اس کے بارے میں اب تمھاری کیا رائے ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بھئی میری تو یہی رائے ہے کہ اس نے کسی طرح اوپر پہنچنے کا راستہ ڈھونڈ نکالا تھا جہاں اس نے یہ جانور دیکھا۔ لیکن یقیناً وہ راستہ بڑا ہی کٹھن اور دشوار گزار ہوگا تبھی تو یہ جانور وہاں سے نیچے نہیں آسکتے۔"

"لیکن یہ جانور وہاں کیسے آ گئے؟" میں نے سوال کیا۔

"بات یہ ہے کہ جنوبی امریکہ یوں تو ایک خاص قسم کے پتھر جسے گرینائیٹ کہتے ہیں کی چٹانوں سے بنا ہوا ہے مگر کسی زمانے میں ہلکا کوئی ایسا زلزلہ آیا ہوگا کہ ایک خطہ زمین کی سطح سے اٹھ کر اچانک

بلند ہو گیا ہوگا۔ اس خطے میں جتنے چرند پرند ہوں گے وہ بھی اس کے ساتھ ہی اوپر اٹھ گئے ہوں گے۔ اسی لیے اس کی لگڑیں بالکل سیدھی دیوار کی طرح ہیں اور چقماق کی قسم کے اس بھورے پتھر کی ہیں جو زمین کی اندرونی تہوں میں پایا جاتا ہے۔ باقی دنیا میں قدیم قسم کے جانور ختم ہو گئے لیکن ممکن ہے وہاں باقی رہ گئے ہوں۔"

"آپ کی تحقیقات بہت شاندار ہیں پروفیسر صاحب۔" میں نے بڑے جوش سے کہا۔ "صرف اسے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی دیر ہے۔"

"میں بھی یہی سمجھا تھا۔" پروفیسر نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا "لیکن جب میں نے زبان کھولی تو لوگ جہالت اور حسد کی وجہ سے اعتراض کرنے لگے اور کسی نے پوری بات کہنے کی مہلت ہی نہ دی۔ آخر میں بھی چڑ گیا اور میں نے سمجھ لیا کہ دنیا میں سب جاہل ہی بستے ہیں۔ یہ نالائق اس قابل ہی نہیں کہ کوئی سائنسی تحقیق ان کے سامنے پیش کی جائے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر خاموش ہو گئے اور میں نے دل میں سوچا کہ واقعی اس شخص کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پروفیسر کے چہرے سے رنج و غم کے اثرات دور ہو گئے اور وہ کہنے لگے۔

"آج رات ایک نمائش ہے تم ضرور چلنا۔"

"کیسی نمائش؟" میں نے پوچھا۔

"ادارہ حیوانیات کے ہال میں مسٹر پرسیول والڈرن جنہیں حیوانیات و نباتات کا ماہر سمجھا جاتا ہے، تقریر کر رہے ہیں اور مجھے ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔ تم ضرور آنا۔ ذرہ مزہ رہے گا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر کے چہرے پر اس شریر بچے کی سی مسکراہٹ پھیل گئی جو کوئی شرارت سوچ کر اس کے نتیجے کے خیال سے دل ہی دل میں لطف لے رہا ہو۔

ہنگامہ

پروفیسر کے مکان سے باہر نکل کر میں نے ٹیکسی لی اور اپنے
آگیا۔ پروفیسر مجھ سے کہہ چکا تھا کہ جو باتیں وہ بتائے وہ اخبا
میں شائع نہ کی جائیں۔ اس لیے جب ایڈیٹر نے پوچھا "کہو
پروفیسر سے کیا بات چیت ہوئی؟" تو میں نے جواب دیا "کچھ
کوئی ایسی بات نہیں جس کی خبر بن سکے۔" ایڈیٹر نے سر سے پیر
مجھے دیکھا اور بولا۔

"یہ تم کیسے کہتے ہو؟ تمھاری آنکھ پر نیل پڑا ہوا ہے۔ یہ بڑی
خبر بن سکتی ہے۔ پروفیسر نے یقیناً تمھیں مارا ہے۔ وہ اس سے
پہلے بھی ایسی حرکتیں کر چکا ہے۔ اخباری نمایندوں کے سا
یہ غنڈہ گردی نہیں چلے گی۔ میں ایسی رپورٹ لکھوں گا کہ
چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔"

میں نے سوچا کہیں بات بگڑ نہ جائے اس لیے مختصر الفا
میں وہ باتیں بتا دیں جو پروفیسر سے مجھے معلوم ہوئی تھیں لیکن

ہی یہ بھی کہا کہ ابھی انھیں شائع نہ کیجیے گا ورنہ پروفیسر بھڑ جائے گا
اور کوئی اور بات نہیں بتائے گا۔ میں اس کا اعتماد حاصل کر
کے پوری باتیں معلوم کروں گا اور انھیں اخبار میں چھاپنے کی
اجازت بھی لے لوں گا۔"

اس کے بعد شہری سے جب میری ملاقات ہوئی اور میں نے اسے
یہ باتیں بتائیں تو وہ میرا مذاق اڑانے لگا۔ اس نے کہا۔

"یار اتنی عظیم دریافت کے بعد کوئی یہ نہیں کہا کرتا کہ ثبوت ضائع
ہو گئے۔ ایسی باتیں بس قصے کہانیوں ہی میں ہوتی ہیں۔"

"لیکن وہ امریکی شاعر اور آرٹسٹ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ چیلنجر کے ذہن کی پیداوار ہے۔"

"اور خاکوں کی وہ کاپی؟"

"وہ کاپی چیلنجر کی ہے۔"

"اور وہ فوٹو ——؟"

"اس میں ایک چڑیا کے سوا رکھا ہی کیا ہے؟"

"مگر وہ معمولی چڑیا نہیں ہے۔ ٹیروڈکٹائل ہے۔"

"یہ بات اسی نے تمھارے ذہن میں بٹھائی ہے۔"

"اور وہ ہڈیاں؟"

"پروفیسر جیسے آدمی کے لیے جعلی ہڈیاں تیار کر لینا کیا مشکل ہے
تم یقین کرو پکا فراڈ ہے وہ۔"

ہنری کی باتیں سُن کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ میرا دل پروفیسر کو فراڈ ماننے کو تیار نہ تھا۔ آخر میں نے ہنری کو راضی کر لیا کہ وہ رات کو ادارہ حیوانیات کے جلسے میں میرے ساتھ چلے۔

جب ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو توقع سے زیادہ مجمع پایا۔ اگلی قطاروں میں بہت سے سائنس دان اور پروفیسر قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹری کے طالب علموں کی بھی بڑی تعداد موجود تھی۔ جب کوئی ہال میں داخل ہوتا تو یہ لوگ فقرے کستے۔ یوں تو تھوڑا بہت ہنگامہ ہر شخص کی آمد پر ہوا لیکن جب پروفیسر چیلنجر داخل ہوئے تو شور و غل کے مارے کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی لیکن شاباش ہے پروفیسر کو۔ میرا شیر برابر مسکراتا رہا۔ کیا مجال ذرہ برابر بھی ماتھے پر بل آیا ہو۔

آخر جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر والڈرن کا تعارف کرایا گیا۔ وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریر کا انداز بڑا اچھا تھا۔ ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کی پیدائش کا حال انھوں نے پُرلطف انداز میں بیان کیا کہ لوگ ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ انھوں نے تیرنے والے اور رینگنے والے جانوروں کا تفصیل سے ذکر کیا اور پھر کنگرو اور چوہے کی ملی جلی شکل کے اس جانور پر پہنچے جسے سائنس دان دودھ پلانے والے موجودہ جان داروں کا باوا آدم قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔

"یہاں آپ جتنے لوگ موجود ہیں سب اسی کی اولاد ہیں۔"

اس پر پچھلی صفوں میں سے ایک طالب علم نے "نہیں نہیں" کی آواز بلند کی جسے سُن کر مسٹر والڈرن نے کہا۔ "اِدھر پچھلی صف میں جو صاحب سُرخ ٹائی لگائے بیٹھے ہیں وہ شاید انڈے سے پیدا ہوئے ہیں۔"

اس پر ایک زوردار قہقہہ لگا۔ غرض ان کی پوری تقریر کے دوران یوں ہی ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ تقریر زور شور سے جاری تھی کہ اچانک ایک بھاری آواز ہال میں گونجی۔

"ابے سُبحانَ اللہ۔"

یہ پروفیسر چیلنجر کی آواز تھی۔ سب ہنس پڑے اور تقریر کرنے والا بوکھلا گیا۔ چند لمحے بعد اُس نے پھر تقریر شروع کی تو پروفیسر نے فقرہ کسا۔

"کیا کہنے!"

پروفیسر نے جب چار پانچ مرتبہ یہ حرکت کی تو مسٹر والڈرن کو غصہ آ گیا۔ وہ چیخ کر بولے۔ "اب تو انتہا ہو گئی۔ مجھے آپ سے کہنا پڑے گا مسٹر چیلنجر کہ آپ بدتمیزی نہ کریں۔"

"اور مجھے آپ سے کہنا پڑے گا مسٹر والڈرن کہ آپ سائنس کا حلیہ نہ بگاڑیں۔" یہ پروفیسر چیلنجر کا جواب تھا جس پر ایسا شور مچا کہ خدا کی پناہ۔

آخر صدر جلسہ نے میز پر گھونسے مار مار کر لوگوں کو خاموش کیا اور تقریر آگے چلی مگر والڈن ایسے گھبرائے ہوئے تھے کہ بہت جلد انھوں نے تقریر ختم کر دی۔

اب پروفیسر چیلنجر کھڑے ہوئے۔

"خواتین و حضرات ۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ رک گئے۔ پھر شور مچاتے ہوئے مجمع پر ایک نظر ڈالی اور بولے "معاف کیجیے گا۔ میرا مطلب ہے خواتین، حضرات اور بچو!" اس پر شور مچانے والے شرما کر چپ ہو گئے اور پروفیسر نے کہا۔

"دوسروں نے سختیاں جھیل کر جو تجربے کیے ہیں انھیں سستی شہرت یا مالی فائدے کی خاطر عام جلسے میں دہرا دینا بہت آسان ہے لیکن خود کوئی ٹھوس تحقیق کرنا بڑا مشکل ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" مسٹر والڈن نے چیخ کر کہا مگر پروفیسر نے ان کی بات نہیں سنی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "فاضل مقرر کی یہ دلیل بڑی بودی ہے کہ چونکہ انھوں نے پرانی قسم کا کوئی جانور اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا اس لیے وہ پایا ہی نہیں جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج بھی دنیا میں ایسے جانور پائے جاتے ہیں جو ہاتھی کو ایک نوالہ بنا لیں اور وہیل مچھلی کو پورا نگل جائیں۔"

"یہ بکواس ہے۔ جھوٹ ہے۔" مجمع سے طرح طرح کی آوازیں بلند ہوئیں۔ ایک آواز آئی "ثابت کرو۔"

پروفیسر نے کہا "میں ثابت کر سکتا ہوں۔ میں وہاں گیا ہوں۔ میں نے ایسے جانور دیکھے ہیں۔"

"جھوٹا کہیں کا ۔۔۔" ایک آواز آئی۔ اس پر پروفیسر چیلنجر بپھر گئے۔ انھوں نے فوراً آستینیں چڑھا لیں اور گرج کر بولے۔

"یہ کس کی آواز ہے؟ کس نے مجھے جھوٹا کہا؟"

مجمع کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب دبکے بیٹھے رہے۔ کوئی نہ بولا۔ پروفیسر نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا۔ "ہر اس شخص کو جس نے کوئی نئی بات دریافت کی، اسی قسم کے احمقوں سے پالا پڑا ہے۔ جب کوئی بڑی تحقیق سامنے آتی ہے تو چھوٹے ذہن اسے سمجھ نہیں سکتے۔ تم ان لوگوں پر پتھر پھینکتے ہو جو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر سائنس کے نئے افق دریافت کرتے ہیں۔ تم اہل علم کو پھانسیاں دینے والے ہو۔ چاہے وہ گلیلیلو ہو۔ چاہے ڈارون ہو۔ چاہے میں ہوں۔"

مجمع چند لمحے خاموش رہا۔ پھر اچانک ایسا ہنگامہ مچا کہ کچھ خواتین نے تو وہاں سے کھسک جانے میں ہی خیریت سمجھی۔ پروفیسر نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں ہلا ہلا کر کہا۔

"سچائی سچائی ہی رہے گی۔ چند بے وقوف نوجوان اور ان

کے احمق بزرگ چاہیں بھی تو اسے دبا نہیں سکتے۔ میرا دعویٰ ہے کہ میں نے سائنس کی ایک نئی راہ دریافت کی ہے۔ اگر تمھیں یقین نہیں ہے تو میرا امتحان لے لو۔ ایک یا دو آدمی میرے ساتھ کر دو۔ کھوٹا کھرا سب ثابت ہو جائے گا۔"

حیوانی جسموں کی ساخت کے ماہر اور مشہور پروفیسر سمرلی نے کھڑے ہو کر کہا: "مسٹر چیلنجر، کیا آپ نے یہ معلومات ایمزن کے علاقے کے اس سفر کے دوران حاصل کیں جو آپ نے دو سال ہوئے کیا تھا؟"

"جی جناب۔"

"آپ سے پہلے اور سائنس دان بھی اُس علاقے میں گئے ہیں۔ اُن کے سفرنامے ہمارے سامنے ہیں۔" مسٹر سمرلی نے کہا۔

"مسٹر سمرلی کی اِطلاع کے لیے میں عرض کر دوں کہ دریائے ایمزن دریائے ٹیمز سے بڑا ہے اور ایک یا دو آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اُنھوں نے پچاس ہزار مربع میل کے علاقے کا چپہ چپہ چھان مارا ہے۔"

اس پر مسٹر سمرلی نے کہا: "میرے دوست نے یہ بتا کر کہ ایمزن ٹیمز سے بڑا ہے، میری معلومات میں جو اضافہ کیا ہے اِس کے لیے میں اُن کا شکر گزار ہوں لیکن کیا وہ بتائیں گے کہ اُنھوں نے کن طول البلاد اور عرض البلاد کے درمیان سفر کیا تھا؟"

"یہ بات میں بتانا نہیں چاہتا۔ البتہ اگر آپ وہاں جانا چاہیں تو میں پتا بتا سکتا ہوں۔"

"میں بڑی خوشی سے جانے کو تیار ہوں۔" مسٹر سمرلی نے بڑے جوش کے ساتھ اعلان کیا۔

"لیکن لوگ آپ کی گواہی کو بھی جھٹلا دیں گے۔ آپ کی تصدیق کے لیے کسی اور آدمی کو بھی ساتھ جانا چاہیے۔ ہے کوئی جانے والا؟"

مجمع میں چند لمحے خاموشی رہی۔ آخر ایک لمبا سا آدمی جو درمیان میں کہیں بیٹھا تھا، اُٹھ کر اسٹیج کی طرف چلا۔ اِدھر اچانک میرے دل میں خیال آیا کہ گلیڈی کو خوش کرنے کا یہی موقع ہے۔ یہ سوچ کر میں بھی لپکا۔ ہنری نے مجھے روکنا چاہا لیکن میں اُس کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گیا اور اسٹیج کے سامنے پہنچ کر بولا۔

"میرا نام ایڈورڈ میلون ہے اور میں ڈیلی گزٹ کا رپورٹر ہوں۔ ایک بالکل غیر جانب دار شخص کی حیثیت سے میں جانے کو تیار ہوں۔"

میرے خاموش ہوتے ہی وہ لمبا آدمی بولا: "میں لارڈ جان روکسٹن ہوں۔ ایمزن تک جا چکا ہوں اور اس علاقے سے واقف ہوں۔ اِس تحقیقی سفر کے لیے میں اپنے آپ کو بڑا موزوں سمجھتا ہوں۔"

مشہور کھلاڑی اور سیاح لارڈ جان روکسٹن کو کون نہیں جانتا

تھا۔ لوگوں نے اُنھیں اور مجھے دونوں کو منتخب کر لیا، اور یہ طے پایا کہ ہم تین آدمی چیلنجر کی کھوئی ہوئی دنیا کا کھوج لگا کر اس کے حیرت انگیز دعووں کی تصدیق کریں گے۔

لارڈ جان روکسٹن کے ٹیم میں شامل ہو جانے سے مجھے بڑا اطمینان ہوا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے جنوبی امریکہ میں غلاموں کی ناجائز تجارت کرنے والوں کا خاتمہ کیا تھا اور اس تجارت کے سرغنہ پیڈرو لوپز کو گولی کا نشانہ بنا دیا تھا۔ ایسے خطرناک سفر میں اس شخص کا ساتھ ایک بہت بڑا سہارا تھا۔

میرے اخبار کے ایڈیٹر کو جب پتا چلا کہ میں اس سفر پر جا رہا ہوں اُس نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور ہدایت کی کہ میں اپنے سفرنامے کی قسطیں بھیجتا رہوں۔ اِشاعت تو ظاہر ہے کہ پروفیسر چیلنجر کی اِجازت مِلنے پر ہی ممکن تھی۔

خطرناک سفر

یہ سطریں میں بحری جہاز فرانسسکا کے کیبن میں لکھ رہا ہوں۔ جب یہ جہاز انگلستان واپس آئے گا تو میری یہ تحریر میرے اخبار کے ایڈیٹر کو پہنچ جائے گی۔

جہاز پر سوار ہوتے وقت پروفیسر چیلنجر ہمیں پہنچانے آئے تھے۔ چلتے وقت اُنھوں نے ایک بند لفافہ دے کر کہا تھا۔

"ساری ہدایات اس میں بند ہیں۔ اِسے اس وقت تک نہ کھولنا جب تک تم دریائے ایمزن کے کنارے واقع قصبہ مناوس تک نہ پہنچ جاؤ اور وہاں پہنچ کر بھی اسے اُسی تاریخ کو اور اُسی وقت کھولنا جو لفافے پر درج ہے۔ تمھیں تمھاری عزت کی قسم ہے کہ اس کے خلاف نہ کرنا۔"

جہاز نے سیٹی دے دی اور چلنے لگا تو پروفیسر چیلنجر یہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔

"یہ مت سمجھنا کہ تم لوگ مجھ پر کوئی احسان کر رہے ہو۔ مجھے کسی

کے تصدیق کرنے نہ کرنے کی پروا نہیں ہے۔ تم جو کچھ کر رہے ہو سائنس کے لیے کر رہے ہو اور بس۔"

ہمارا سفر آرام سے گزرا۔ راستے بھر لارڈ جان روکسٹن اپنی شکاری مہموں کے قصے سناتے رہے۔ جو واقعی حیرت انگیز تھے۔ آخر کسی قابلِ ذکر واقعے کے بغیر ہم ماناؤس پہنچ گئے جو امیزن کے کنارے ایک چھوٹا سا لیکن اہم قصبہ تھا۔ یوں تو ہم نے ایک سرائے میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن وہاں ہم مقامی لوگوں کے لیے اچھا خاصا تماشا بن جاتے۔ خدا بھلا کرے برازیل میں تجارت کرنے والی برطانوی کمپنی کے نمائندے شارٹ مین کا جس نے اپنے بنگلے میں ہمیں ٹھہرایا اور بہت کچھ آؤ بھگت کی۔

پروفیسر چیلنجر نے لفافہ کھولنے کی جو تاریخ مقرر کی تھی اس میں ایک ہفتہ باقی تھا لہٰذا ہم آرام کرتے رہے۔ میرے دو ساتھیوں میں سے ایک مسٹر سمرلی چھیاسی سال کے سنجیدہ بزرگ تھے اور بہت کچھ سرد گرم دیکھے ہوئے تھے انھیں کیڑوں مکوڑوں اور چڑیوں وغیرہ کے بارے میں تحقیق کا جنون تھا۔ وہ اسی میں مصروف ہو گئے۔ روز صبح کو تتلیاں پکڑنے کا جال اور بندوق لے کر وہ اِدھر اُدھر نکل جاتے اور شام کو بہت سے نمونے لیے ہوئے واپس آتے۔ مجھے ان کی ایک ہی بات ناپسند تھی اور وہ یہ کہ وہ بہت گندے رہتے تھے۔ اپنے میلے کپڑوں یا میلے جسم سے

انھیں ذرا وحشت نہیں ہوتی تھی۔

دوسری طرف لارڈ جان روکسٹن ہر وقت صاف ستھرے اور خوش پوش رہنے کے عادی تھے۔ روز صبح بڑے اہتمام سے شیو بناتے اور استری کیے ہوئے کپڑے پہنتے۔ اس لیے ان سے میری گاڑھی چھنتی تھی۔

راستے میں جب ہمارا جہاز پارا میں ٹھہرا تھا تو ہم نے اپنے سفر میں ساتھ لے چلنے کے لیے کچھ آدمی بھرتی کر لیے تھے۔ ان میں ایک زمبو نامی حبشی بھی تھا۔ بالکل سیاہ فام اور کسی دیو کی طرح طاقت ور۔ فرماں برداری میں وہ ایک سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح تھا اور عقل بھی بس گھوڑے ہی جتنی تھی۔ اسے ہم نے جہاز کی کمپنی کی سفارش پر رکھا تھا۔ اسی کمپنی میں نوکری کر کے وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے لگا تھا۔

زمبو کے علاوہ پارا میں ہی ہم نے ملی جلی نسل کے دو اور آدمی گومز اور مینوئل بھی رکھ لیے تھے۔ ان دونوں کی ڈاڑھیاں تھیں اور وہ چیتوں کی طرح پھرتیلے تھے۔ دونوں عرصے سے اس علاقے میں تھے اور گومز تو فر فر انگریزی بولتا تھا۔ ان لوگوں کو کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور سامان اٹھا کر ساتھ چلنے کے لیے رکھا گیا تھا۔ ان کے علاوہ ہم نے بولیویا کے ایک قبیلے کے تین آدمیوں کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں جو کشتی چلانے

اور مچھلیاں پکڑنے کے ماہر تھے۔ دریائی سفر میں ان کی بڑی ضرورت تھی۔ ان تینوں کے سردار کو ہم اس کے قبیلے کی رعایت سے موجو ہی کہتے تھے۔ باقی دو کے نام جوزے اور فرنینڈو تھے۔

یہ ہفتہ بڑی مشکل سے کٹا۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن بھی آ گیا جب ہمیں وہ لفافہ کھولنا تھا۔ ہم تینوں برآمدے میں بید کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں گول میز تھی جس پر لفافہ رکھا ہوا تھا۔ لفافے پر پروفیسر چیلنجر کے بھدے خط میں لکھا تھا۔

"لارڈ جان روکسٹن اور ان کی جماعت کو ہدایت ہے کہ وہ اسے مناؤس میں 15 جولائی کو دن کے ٹھیک بارہ بجے کھولیں۔"

لارڈ جان روکسٹن نے اپنی گھڑی اتار کر لفافے کے پاس ہی رکھ دی تھی۔ "ابھی سات منٹ باقی ہیں۔" لارڈ جان روکسٹن نے بیزاری سے کہا۔

مسٹر سمرلی نے مسکرا کر لفافہ اٹھا لیا اور بولے۔ "اگر چند منٹ پہلے بھی اسے کھول لیا جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"نہیں جناب۔" لارڈ جان نے کہا۔ "پروفیسر نے ہمیں ہماری عزت کی قسم دلائی ہے۔ اس کا پاس تو کرنا ہی پڑے گا۔"

مسٹر سمرلی نے لفافہ رکھ دیا اور کہنے لگے۔ "اگر اس میں سے کوئی کام کی بات نہ نکلی تو میں نے تو سوچ لیا ہے کہ پہلے جہاز سے لوٹ جاؤں گا۔"

"وقت ہو گیا۔" لارڈ جان نے جن کی نظریں برابر گھڑی کی طرف لگی ہوئی تھیں، کہا اور لفافہ اٹھا کر کھولنے لگے۔ میرا کلیجا نہ جانے کیوں منہ کو آنے لگا۔ لارڈ جان نے لفافہ چاک کر کے اندر سے کاغذ نکالا اور تہیں کھول کر اسے میز پر پھیلا دیا مگر یہ بالکل سادہ۔ انھوں نے اسے الٹا تو دوسری طرف سے بھی وہ سادہ تھا۔

ہم تینوں احمقوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ یکایک مسٹر سمرلی نے قہقہہ لگایا اور کہا۔

"لو بھئی، مسئلہ حل ہو گیا۔ سادہ کاغذ اس بات کا ثبوت ہے کہ پروفیسر فراڈ ہے۔ اب ٹھنڈے ٹھنڈے واپس لوٹ چلو۔ پھر اس کم بخت جعل ساز سے سمجھیں گے۔"

ہم دونوں کو مسٹر سمرلی کی اس بات سے اتفاق تھا لیکن ابھی ہم نے اپنی رائے ظاہر بھی نہیں کی تھی کہ اچانک آواز آئی۔

"کیوں بھئی، ہم بھی آ جائیں؟"

ہم تینوں مارے حیرت کے اچھل پڑے۔ پروفیسر چیلنجر سامنے کھڑے تھے۔ ان کے سر پر تنکوں کا ہیٹ تھا جس میں بچوں کے ہیٹ جیسا رنگین فیتہ لگا ہوا تھا۔

"بھئی معاف کرنا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ اس وقت سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا لیکن راستے میں دیر ہو گئی۔"

یہ کہہ کر پروفیسر چیلنجر نے سب سے ہاتھ ملایا اور ایک کرسی

پر بیٹھ گئے جو اُن کے بوجھ سے چرچرانے لگی۔ ذرا دم لینے کے بعد اُنھوں نے کہا: "میں نے سوچا تم لوگوں کو کتنی ہی تفصیل سے ہدایات دے دُوں، نقشے بنا دُوں پھر بھی کیا پتا کہ تم وہاں پہنچ سکو گے یا نہیں۔"

اس کے بعد پروفیسر نے بڑی بے تکلّفی سے اِعلان کیا کہ اس وقت سے جماعت کے رہنما وہ خُود ہیں اور کل روانگی ہے۔

چُوں کہ ہمیں دریا کے بہاؤ کی مخالف سمت سفر کرنا تھا اس لیے لارڈ جان نے پہلے سے ایک بڑی سٹیم لانچ کرائے پر لے لی تھی۔ اس میں سوار ہو کر ہم مُسلسل تین روز شمال مغرب کی طرف سفر کرتے رہے۔ دریا کا دہانہ اگرچہ اس جگہ سے کوئی ہزار میل دُور تھا اِس کے باوجُود اس کا پاٹ اِتنا چوڑا تھا کہ دونوں طرف کنارہ نظر نہ آتا تھا۔

سفر کے چوتھے دِن ہم پروفیسر چیلنجر کی ہدایت پر ایک معاوِن دریا میں مُڑ گئے جو ایمزن میں آ کر گرتا تھا۔ یہ نسبتاً کم چوڑا تھا جُوں جُوں ہم آگے بڑھتے گئے، پاٹ چھوٹا ہوتا گیا۔ دو دِن اور سفر کے بعد ہم ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچے۔ یہاں پروفیسر نے اِصرار کیا کہ ہم اُتر جائیں اور لانچ واپس کر دی جا... اُنھوں نے کہا۔ آگے چل کر چھوٹے چھوٹے آبشار ملتے ہیں

لہٰذا لانچ بے کار ہے۔"

یہاں پروفیسر چیلنجر نے ایک مرتبہ پھر ہم سے قسم لی کہ ہم اس راستے کی تفصیل کسی موقع پر بھی ظاہر نہیں کریں گے۔ یہ قسم مُلازموں سے بھی لی گئی تاکہ جو لوگ اخبار میں یہ رپورٹ پڑھیں نقشے پر یہ راستہ تلاش کرنے کی کوشش نہ کریں کیونکہ اس میں اُنھیں کامیابی نہیں ہوگی۔

2 اگست کو ہم نے لانچ چھوڑ دی اور مقامی باشندوں سے چار چھوٹی چھوٹی ہلکی کشتیاں حاصِل کیں جو بانس کے ڈھانچوں پر کھال منڈھ کر بنائی گئی تھیں۔ اور ننھے ننھے آبشاروں سے اُنھیں گزارا جا سکتا تھا۔ سارا سامان کشتیوں پر لادا گیا اور مقامی باشندوں میں سے دو کو، جن کے نام اٹاکا اور اِپی تُوٹھے، ساتھ لے لیا گیا۔ یہ دو آدمی پروفیسر چیلنجر کے ساتھ پہلے بھی جا چُکے تھے اب جو اُنھوں نے سُنا کہ دوبارہ اسی خوفناک سفر پر جانا ہے تو کانوں پر ہاتھ دھرنے لگے لیکن گاؤں کے سردار کو کچھ رقم دے کر اُنھیں منا لیا گیا۔

یہاں تک کی رپورٹ میں لانچ کے ذریعے بھیج رہا ہوں کل ہم آگے روانہ ہوں گے اور آباد دُنیا سے ہمارا رشتہ کٹ جائے گا۔

خاکوں کی کتاب والی سطح مُرتفع اب ہمارے سامنے ہے اور

ہمیں یقین ہوگیا ہے کہ پروفیسر چیلنجر کا بیان غلط نہ تھا۔ اب تک ہم دیوار کی طرح سیدھی چٹانوں پر چڑھنے کا راستہ دریافت نہیں کرسکے ہیں۔ ہمارے ملازموں میں سے ایک آدمی زخمی ہوگیا ہے۔ اُسے ہم واپس بھیج رہے ہیں اور وہی یہ خط لے جائے گا۔

آخری گاؤں سے روانہ ہونے سے پہلے رات کو ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ہم لوگ ایک جھونپڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور حبشی ملازم زمبو پہرے پر تھا کہ اچانک گومز جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتا تھا، چاقو لیے آیا اور اُس نے زمبو کو مار ہی ڈالا تھا مگر زمبو بڑا پھرتیلا تھا۔ اُس نے کاوا دے کر وار خالی کر دیا اور چاقو چھین لیا۔ ہم لوگوں نے گومز کو ڈانٹا اور دونوں میں صلح صفائی کرا کے ہاتھ ملوا دیا۔

پروفیسر چیلنجر اور مسٹر سمرلی میں برابر چونچیں ہوتی رہتی تھیں جن سے ہم خوب لطف لیتے۔ سمرلی کو چڑانے کی عادت تھی لیکن پروفیسر بھی خوب چبھتے ہوئے جواب دیتا۔ بعض دفعہ وہ بچوں کی طرح لڑ پڑتے جس پر مجھے حیرت ہوتی کہ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی ذہانت کا لوہا منوا رکھا ہے۔

ہاں تو جب ہم گاؤں سے روانہ ہوئے تو سارا سامان دو کشتیوں میں بھر دیا گیا اور ہم بارہ آدمی چھ چھ کر کے ایک ایک کشتی میں سوار ہوگئے۔ البتہ اتنی احتیاط کی کہ چیلنجر اور سمرلی

الگ الگ کشتیوں میں رکھا۔ میں چیلنجر والی کشتی میں تھا۔ دو دن تک ہم دریا میں سفر کرتے رہے جس کا پانی سیاہ تھا لیکن اس کے باوجود اس قدر شفاف تھا کہ تہ تک کی ہر چیز نظر آتی تھی۔ دریائے ایمزن میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے آدھے معاون دریا سیاہ ہیں اور آدھے سفید۔ راستے میں دو ننھے ننھے آبشار ملے اور ہم خشکی پر آدھ میل کا چکر کاٹ کر اپنی کشتیوں کو نکال لے گئے۔ ہلکی کشتیوں کو اُٹھا کر لے جانا نہایت آسان تھا۔ دریا کے دونوں طرف گھنے جنگل تھے۔ میرے لیے وہاں کے درخت بالکل نئی قسم کے تھے۔ ان کے تنے بہت اُوپر تک سیدھے چلے گئے تھے اور منہ اوپر اٹھا کر دیکھنے سے ہی ان کی شاخیں اور پتے وغیرہ نظر آتے تھے۔

یہاں بندر، سانپ یا جو دوسرے جانور تھے، وہ درختوں کے اُوپر رہتے تھے، جہاں انھیں دھوپ مل سکتی تھی۔ کبھی کبھی دور کوئی ریچھ بھی نظر آ جاتا تھا۔ تیسرے دن صبح کو دور سے ڈھول بجنے کی مدھم سی آواز سنائی دی جو ہوا کے رخ کے ساتھ کبھی آتی اور کبھی بند ہو جاتی۔

"یہ کیسی آواز ہے؟" میں نے پوچھا جس پر لارڈ جان نے لاپروائی سے کہا "وحشی باشندوں کا اعلانِ جنگ ہے۔"

گومز نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس کی تصدیق کی اور کہا "یہ جنگلی ڈھول ہیں۔ جنگلی باشندے برابر ہم پر نظر رکھتے ہیں اور اب

ہمارے آنے کی اِطلاع آس پاس کے قبیلوں کو دی جا رہی ہے۔ وہ جب چاہیں ہمیں قتل کر سکتے ہیں۔"

اور پھر اس دن سہ پہر کو ـــــ (میری ڈائری کے مُطابق، اُس روز منگل تھا اور اگست کی 8 ر تاریخ)، اچانک ہر طرف سے ڈھول کی آوازیں آنے لگیں۔ واقعی ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے تھے۔ اُن کی لے بدلتی رہتی تھی۔ کبھی کوئی ڈھول اچانک خاموش ہو جاتا اور کچھ وقفے بعد تیزی سے بجنے لگتا۔ یہ ان لوگوں کا پیغام رسانی کا طریقہ تھا۔

اُن آوازوں سے مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ کہہ رہی ہوں۔ "ہم جب چاہیں تُمھیں قتل کر سکتے ہیں ـــــ جب چاہیں تُمھیں قتل کر سکتے ہیں۔" آوازیں دن بھر سُنائی دیتی رہیں اور ہم سب سہمے رہے۔ لیکن میں چیلنجر اور سمرلی کی بہادری کا قائل ہو گیا۔ وہ خطرے سے بے تعلق درختوں، بیلوں اور گھاس کی قسموں کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

رات کو ہم نے کنارے پر قیام کرنے کے بجائے دریا کے بیچ اپنی کشتیاں پتھروں سے باندھ دیں اور جاگتے رہے مگر رہی اور صُبح جب ہم آگے روانہ ہوئے تو یہ خوفناک آوازیں ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئیں۔

تین بجے سہ پہر کے قریب ہمیں پھر ایک آبشار ملا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں پچھلے سفر کے دوران چیلنجر کا سامان ضائع ہو گیا تھا۔ ہم نے اپنا سامان اور ہلکی کشتیاں اُٹھائیں اور کنارے پر چلنے لگے۔ کوئی ایک میل پیدل چل کر دوبارہ ہم نے کشتیاں پانی میں اُتار دیں۔ اور دریائی سفر شروع کیا اور دس میل چل کر پھر پڑاؤ ڈال دیا گیا۔

صُبح کو جب ہم دوبارہ روانہ ہوئے تو پروفیسر چیلنجر بڑی بے چینی سے بائیں طرف دیکھتے جا رہے تھے، جیسے کچھ تلاش کر رہے ہیں۔ آخر ایک درخت آیا جو ترچھا ہو کر پانی پر جُھک گیا تھا۔ اسے دیکھ کر اُنھوں نے خوشی کا نعرہ لگایا اور کہا کہ بس یہاں سے آدھے میل کے فاصلے پر انوکھی دُنیا کا چور دروازہ ہے۔

ندی کے کنارے بانسوں کا گھنا جُھنڈ ایک دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ پروفیسر چیلنجر نے کہا۔ "غور سے دیکھتے رہو۔ جہاں یہ سبز دیوار زردی مائل دیوار سے ملے وہیں ہمیں رُک جانا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ بانسوں کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اس کے بعد نرکُلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ دونوں کے رنگ میں فرق تھا۔ پروفیسر چیلنجر کی ہدایت پر ہم نرکُلوں کو ہٹاتے ہوئے اپنی کشتیوں کو اندر دھکیل کر لے گئے اور کوئی سو گز چلنے کے بعد ایک چشمے میں پہنچ گئے جس میں اُتھلا پانی تھا۔ اس کی چوڑائی بیس گز سے زیادہ نہ رہی ہو گی۔ دونوں طرف بڑے گھنے درخت، بیلیں، پودے

اور جھاڑیاں تھیں اور چشمے کے اوپر بھی درختوں کی ٹہنیوں اور پتوں نے ایک چھت سی بنا دی تھی جس میں سے آسمان نظر نہ آتا تھا۔ گویا یہ سبز رنگ کی ایک کشادہ سرنگ تھی جس میں سے ہم گزر رہے تھے۔

یہاں جانور بھی بہت تھے۔ مخملی کھال والے بندر اپنے دودھ جیسے سفید دانت نکال نکال کر ہمارا استقبال کر رہے تھے اور دوسرے جانور بھی رک رک کر غور سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ان میں وہ دہشت نہیں تھی جو شکاریوں کے ڈر سے جانوروں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سبز سرنگ میں یہ سفر تین دن جاری رہا۔ گومز نے بتایا کہ کوروپوری کے ڈر سے مقامی باشندے بھی اس طرف نہیں آتے۔ کوروپوری یعنی جنگل کی بدروح، جس سے ڈرنا ہی چاہیے۔

تیسرے دن شام کو ہمیں معلوم ہوگیا کہ اب کشتیوں کا سفر جاری نہیں رہ سکتا اس لیے کہ چشمہ برابر اتھلا ہوتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ ہماری کشتیاں ریت میں دھنس گئیں۔ ہم انھیں گھسیٹ کر کنارے پر لے آئے اور وہیں رات بسر کی۔

صبح اٹھ کر ہم نے کشتیاں جھاڑیوں میں چھپا دیں اور کلہاڑے لے کر قریب کے ایک درخت کی چھال پر نشان لگا دیے تاکہ کشتیوں کو تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اس کے بعد ہم نے سامان کندھوں پر اور یوں ہمارے سفر کا سب سے مشکل حصہ شروع ہوا۔

یہاں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ پروفیسر چیلنجر خود ہی ہمارے لیڈر بن بیٹھے تھے اور ساری باتوں کا فیصلہ وہ خود ہی کرتے تھے حالاں کہ لندن سے روانگی کے وقت مسٹر سمرلی کو ٹیم کا لیڈر بنایا گیا تھا۔ جب ہمیں سامان خود اٹھا کر چلنا پڑا تو پروفیسر چیلنجر نے ہوا کا دباؤ معلوم کرنے کے آلے، بیرومیٹر، کا ڈبا سمرلی کو دے دیا کہ اسے اٹھالو۔ سمرلی کو یہ بات ناگوار گزری۔ انھوں نے کہا۔

"جناب، کس حیثیت سے آپ مجھے یہ حکم دے رہے ہیں؟"

"ٹیم کے لیڈر کی حیثیت سے۔" چیلنجر نے جواب دیا اور سمرلی بگڑ گئے۔ انھوں نے کہا: "جناب، میں آپ کو لیڈر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں۔"

ہمارا خیال تھا کہ چیلنجر بھی اسی تلخ لہجے میں جواب دیں گے لیکن انھوں نے مسکرا کر کہا: "آپ کے خیال میں میری پوزیشن کیا ہے؟"

"آپ ایک ایسے شخص ہیں جس کے جھوٹ سچ کا امتحان لینے کے لیے یہ کمیٹی مقرر کی گئی ہے۔ آپ اپنے ججوں کے ساتھ چلیے اور بس۔"

اب چیلنجر نے اپنا ترپ کا پتا استعمال کیا اور وہیں گھاس پر بیٹھ کر بولے: "تو ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں۔ میرا جب جی چاہے گا آجاؤں گا۔ میں جب رہنما نہیں ہوں تو اس جماعت کی رہنمائی کیوں کروں؟"

"خُدا کا شکر ہے کہ وہاں دو سمجھ دار آدمی موجود تھے یعنی لارڈ جان روکسٹن اور میں۔ ہم نے تھو تھو کر کے دونوں کو ٹھنڈا کیا۔ سمرلی نے خاموشی سے چیلنجر کی رہنمائی قبول کر لی اور بیرومیٹر کا ڈبا اُٹھا کر چلنے لگے۔ لیکن آپس میں بات چیت بند تھی۔

وہ چشمہ ایک پتلی سی نالی بن کر گھاس اور پودوں میں غائب ہو چکا تھا۔ یہاں بڑے بڑے مچھروں کے جھنڈ کے جھنڈ بادل کی طرح اُڑ رہے تھے۔ زمین یہاں اس قدر کائی تھی کہ گھٹنوں گھٹنوں تک ہمارے پیر اس میں دھنس جاتے تھے۔

دوسرے دن ہم ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جو چڑھائی کی طرف جاتا تھا۔ جنگل ہلکا ہوتے ہوتے قریب قریب ختم ہو گیا، استوائی طرز کے دیو قامت درختوں کے بجائے اب کہیں کہیں پام کے جھنڈ تھے۔ ہم قطب نما اور دوسرے آلات کی مدد سے سفر کر رہے تھے۔

پروفیسر چیلنجر اور دو مقامی آدمی اس راستے پر پہلے بھی آ چکے تھے۔ کبھی کبھی ان میں اس بات پر اختلاف ہو جاتا کہ کس طرف چلنا چاہیے۔ آخر دونوں مقامی آدمیوں کی رائے مانی جاتی اور بعد میں خود چیلنجر یہ مانتے کہ ہم ٹھیک راستے پر ہیں۔

زمین پتھریلی تھی اور چڑھائی مسلسل۔ پھر ایک پتھریلا ڈھال ملا جو اتنا طویل تھا کہ اُسے پار کرنے میں دو دن لگے۔ اب پام کے جھنڈ ختم ہو چکے تھے اور جنگلی پھلوں کے درخت بکثرت تھے۔

کبھی کبھی کوئی صاف شفاف چشمہ ملتا اور ہم مچھلیاں پکڑ کر خوب مزے دار دعوت اُڑاتے۔

نو دن میں ہم نے کوئی ایک سو بیس میل پیدل سفر کیا۔ اب ہمیں بانس کا جنگل ملا جو اتنا گھنا تھا کہ سامان لے کر گزرنا مشکل تھا۔ ہم کلہاڑیوں سے بانس کاٹ کاٹ کر راستے بناتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ اس جنگل کو عبور کرنے میں پورا دن لگا۔ مغرب کے بعد اس سے باہر نکلے اور وہیں ہم نے پڑاؤ ڈال دیا۔ صبح کو جب روشنی ہوئی تو ہم نے دیکھا کہ سامنے پھر چڑھائی ہے اور جگہ جگہ اونچی اونچی کانٹے دار جھاڑیاں ہیں۔ بہت دور وہیل مچھلی کی پیٹھ کی طرح خم کھاتی ہوئی سیاہی مائل پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ تیسرے پہر تک ہم نے یہ پہاڑی پار کر لی اور ایک وادی میں پہنچ گئے جس کے دوسرے کنارے پر پہاڑیوں کا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ یہاں ایک واقعہ پیش آیا جس کا تذکرہ دل چسپی سے خالی نہ ہو گا۔

پروفیسر چیلنجر، جو سب سے آگے تھے، اچانک دائیں طرف دیکھ کر چلائے۔ "وہ دیکھو ـــ وہ دیکھو۔"

ہم سب نے دیکھا۔ یہ بھورے رنگ کا بہت بڑا پرندہ تھا جو زمین سے اُڑا تھا اور کم بلندی پر پرواز کرتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔

"دیکھا ـــ" چیلنجر نے سمرلی سے کہا جس کا انھوں نے بڑی بے دلی سے جواب دیا۔ "ہاں دیکھا۔"

"یہ ٹیروڈ کٹائل تھی" چیلنجر نے یقین کے ساتھ کہا۔

"تمہارا سر تھا۔ مجھے یہ بڑی قسم کا بگلا معلوم ہوتا تھا۔"

چیلنجر غصے میں چپ چاپ چل پڑے۔ اتنے میں لارڈ جان میرے برابر آگئے۔ اُن کے ہاتھ میں دُوربین تھی۔ وہ کہنے لگے "میں نے جلدی سے دُوربین نکال لی تھی۔ میں شکاری ہوں اور ہزاروں قسم کے پرندے دیکھ چکا ہوں لیکن ایسا پرندہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا۔"

"تو گویا ہم اُس اَن دیکھی دُنیا کے قریب پہنچ گئے ہیں۔" میں نے سوچا۔

اب ہم بڑے دریا سے چھوٹی خفیہ ندی میں اور پھر سبز نباتاتی سُرنگ میں سے گزرنے والے چشمے سے ہوکر، سے جنگلات، پہاڑیاں وادیاں، بانس کے جھنڈ وغیرہ پار کرکے ایسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں ہماری منزل سامنے ہے۔ اس وقت جس جگہ ہم نے کیمپ لگایا ہے وہاں سے چقماق کی بلند عمودی دیوار کا قریبی حصہ کوئی سات میل دُور ہے اور دونوں طرف جہاں تک نظر جاتی ہے یہ دیوار بل کھاتی دُور تک چلی گئی ہے۔ چیلنجر ہر وقت فخر سے چھاتی پھلائے رہتے ہیں۔ سمرلی خاموش ہیں۔ لیکن انھیں اب بھی چیلنجر کے دعوے کی صحت پر شک ہے۔

کل ہم اس پتھر کی دیوار کے سائے میں کیمپ لگائیں گے۔ ہمارے



ملازموں میں سے جوزے بانسوں کا جنگل پار کرتے ہوئے ایک ٹوٹے ہوئے بانس سے زخمی ہو گیا تھا۔ تیز نوک اُس کا بازو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ واپس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ خط میں اُسی کے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی قسط انتہائی سنسنی خیز ہو گی۔

موت کے جنگل میں

اُف میرے خدا۔ ہمارا کیا حشر ہو گا۔ ہم جن مصیبتوں میں گرفتار ہیں ان کا خاتمہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہو سکتا ہے ہمیں ساری زندگی اس عجیب و غریب جگہ گزار دینا پڑے۔ میں جتنا سوچتا ہوں اتنی ہی مایوسی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم جس جگہ ہیں وہاں کا صحیح صحیح پتا اور راستے کا نقشہ بنا کر بھیج دیں تاکہ ہمارے دوست امدادی جماعت بھیج کر ہمیں بچا لیں کیونکہ ہم اگر ایسا کریں بھی تو خط جانے اور امدادی جماعت آنے تک ہماری قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہو گا۔ میرے تینوں ساتھی نہایت ذہین اور جرأت والے لوگ ہیں۔ انھی سے آخری آس ہے لیکن جب میں ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار دیکھتا ہوں تو میرا جی ڈوبنے لگتا ہے۔ ہم مہذب دنیا سے اس طرح کٹ گئے ہیں جیسے چاند پر پہنچ گئے ہوں۔

آئیے اب ذرا تفصیل سے بتاؤں کہ ہم اس حالت کو کیسے پہنچے۔ پچھلے خط میں میں نے بتایا تھا کہ ہم اس سطحِ مرتفع سے صرف سات

میل کے فاصلے پر ہیں جس کا ذکر چیلنجر نے کیا تھا اور جہاں ہمیں جانا تھا جب ہم اُس کے اور قریب پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ چقماق کی یہ دیوار کم سے کم ایک ہزار فٹ بلند ہے۔ اس کے اُوپر کنارے پر گھنی جھاڑیاں اور ان کے پیچھے بلند درختوں کی چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔

ہم نے چقماق کی دیوار کے بالکل نیچے اپنا کیمپ لگا دیا۔ دیوار تو سیدھی ہوتی ہے مگر یہ باہر کی طرف جھکی ہوئی تھی، اس وجہ سے چڑھنا ناممکن تھا۔ سطح مرتفع سے تقریباً ملی ہوئی ایک اور پہاڑی تھی جو اتنی ہی بلند تھی۔ غالباً یہ کسی زمانے میں سطح مرتفع کا ہی حصہ رہی ہوگی لیکن بعد میں ایک چوڑی دراڑ نے اسے جدا کر دیا۔ اس پہاڑی پر ایک بہت اونچا اور مضبوط درخت بھی تھا۔ پروفیسر چیلنجر نے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں نے اس پر ٹیروڈکٹائل کو بیٹھے دیکھا تھا۔ میں نے کچھ دور چڑھنے کی کوشش کی اور پھر اُس پر گولی بھی چلائی مگر وہ زخمی ہونے کے بعد اُڑ کر سطح مرتفع پر چلا گیا۔"

اس ذکر پر پروفیسر سمرلی کے چہرے پر پشیمانی کے آثار نمودار ہوئے شاید اب انھیں پروفیسر چیلنجر کی کہانی پر اعتبار آتا جا رہا تھا۔ چیلنجر نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں جب ٹیروڈکٹائل کہتا ہوں تو مسٹر سمرلی اُسے بگلا سمجھتے ہیں۔"

یہ کہہ کر چیلنجر نے جھک کر انھیں سلام کیا اور مسٹر سمرلی نے شرمندہ

ہو کر منہ پھیر لیا۔

آخر اوپر چڑھنے کے طریقوں پر غور کرنے کے لیے ہم نے ایک میٹنگ بلائی جس کی صدارت پروفیسر چیلنجر نے کی۔ انھوں نے کہا۔

"پچھلے سفر کے دوران میں نے اس پر چڑھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی تھی۔ جب میں ناکام ہو گیا تو کسی اور کے کامیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں کوہ پیمائی کے فن میں بھی ماہر ہوں۔"

اُن کے اِس دعوے پر کسی نے اِعتراض نہیں کیا۔ پروفیسر نے کہا۔ "پچھلی مرتبہ میرے پاس کوہ پیمائی کا سامان نہیں تھا لیکن اِس دفعہ میں وہ بھی لایا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ سطح مرتفع پر تو نہیں البتہ اس الگ پہاڑی پر چڑھا جا سکتا ہے۔"

پروفیسر چیلنجر نے یہ بھی بتایا کہ انھوں نے سطح مرتفع کے مشرق میں کوئی چھ میل تک سفر کر کے دیکھا تھا کہ شاید اوپر جانے کا کوئی راستہ نظر آجائے یا ایسی کوئی جگہ مل جائے جدھر سے چڑھنا ممکن ہو مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس پر مسٹر سمرلی نے کہا۔

"آپ مشرق کی طرف گئے تھے تو کیوں نہ ہم مغرب کی طرف جا کر دیکھیں، شاید کوئی صورت نکل آئے۔"

لارڈ جان رکسٹن نے اپنی رائے ظاہر کی۔ "کیوں نہ ہم کسی ایک سمت سفر کریں اور پوری سطح مرتفع کا چکر لگا کر اسی جگہ واپس آجائیں۔

اس طرح کوئی نہ کوئی جگہ ایسی مل ہی جائے گی جہاں سے اُوپر چڑھا جا سکتا ہو۔"

اس پر پروفیسر چیلنجر نے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ کوئی راستہ نہیں ملے گا۔ اگر ہوتا تو اُوپر کے جانور نیچے آ گئے ہوتے اور پھر اس علاقے اور ہماری دنیا میں کوئی فرق باقی نہ رہ جاتا۔"

یہ سُن کر ہم سب مایوس ہو گئے لیکن چیلنجر نے پھر کہا۔ "چڑھنے کا راستہ نہ سہی، اُوپر پہنچنے کا کوئی خفیہ راستہ ضرور ہو گا۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" سمرلی نے کہا۔

"اس لیے کہ ہم سے پہلے میپل وہائیٹ وہاں پہنچ چکا ہے اور اُس نے اُس عجیب و غریب جانور کی تصویر وہیں پہنچ کر کھینچی تھی۔"

"یہ کوئی دلیل نہیں۔" سمرلی نے سر ہلا کر کہا۔ "جو بات ثابت نہیں ہوئی اُس کی بنیاد پر کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ آپ کی اس سطحِ مُرتفع کا وجود میں نے تسلیم کر لیا اس لیے کہ یہ میرے سامنے ہے لیکن اِس پر عجیب و غریب جانوروں کا ہونا میں اس وقت تک تسلیم نہیں کر سکتا جب تک ثبوت نہ مل جائے۔"

یہ سُن کر چیلنجر کو غصہ آ گیا۔ انھوں نے کہا۔

"تمھارے کسی چیز کو ماننے یا نہ ماننے کی کوئی اہمیت نہیں۔ کیا کم ہے کہ تمھاری حقیر عقل نے اس سطحِ مُرتفع کا وجود تسلیم

کیا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اچانک چیلنجر اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور اُنھوں نے سمرلی کی گردن پکڑ کر اُسے گھمایا اور کہا۔ "لو وہ دیکھو۔"

ہم سب نے دیکھا۔ چقماق کی دیوار کے اُوپر کے حصے پر جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں، ایک بہت بڑا سانپ بلکہ اژدہا لٹک رہا تھا۔ اس کا سر چپٹا سا تھا۔ کوئی ایک منٹ تک وہ وہاں کلبلاتا رہا اور پھر ایک منٹ بعد رینگ کر جھاڑیوں میں چھپ گیا۔

پروفیسر چیلنجر سمرلی کی گردن پکڑے اُن کا منہ اُوپر اُٹھائے کھڑے رہے اور سمرلی نے بھی اپنی محویت میں اس کا خیال نہ کیا لیکن جب سانپ چلا گیا تو اُنھوں نے چیلنجر کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟"

چیلنجر نے کہا۔ "اُمید ہے اب میرے دوست کو یقین آ گیا ہو گا کہ اُوپر زندگی کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔"

بہرحال تھوڑی سی بحث کے بعد اس پر اِتفاق ہو گیا کہ مغرب کی سمت سفر کیا جائے اور اُوپر چڑھنے کا راستہ تلاش کیا جائے۔ زمین بہت پتھریلی اور بڑے بڑے پتھروں سے اٹی پڑی تھی اِس لیے ہمارے آگے بڑھنے کی رفتار کافی دھیمی تھی۔

کچھ دور چل کر ہماری خوشی کی اِنتہا نہ رہی کیونکہ یہاں ہم نے ایک کیمپ کے آثار دیکھے۔ گوشت کے خالی ڈبے، ٹین کھولنے

کا ایک زنگ آلود اوزار اور دوسرا سامان پڑا ہوا تھا۔ ایک تڑا مڑا اخبار بھی تھا جس کی تاریخ پڑھی نہ جا سکی۔

"یہ سامان میرا نہیں ہے۔" چیلنجر نے کہا۔ "یہاں میپل وہائیٹ نے کیمپ لگایا ہوگا۔"

لارڈ جان بڑے غور سے اس جھاڑی کی طرح کے درخت کو دیکھ رہے تھے جس کے سامنے یہ کیمپ لگایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا۔ "دیکھو۔ یہ نشان سمت بتانے کے لیے لگایا گیا ہے۔"

لکڑی کا ایک نوکیلا تختہ کیل سے درخت میں ٹھونکا گیا تھا جس کی نوک کا رُخ مغرب کی سمت تھا۔ یقیناً یہ نشان بعد میں آنے والوں کی رہنمائی کے لیے لگایا گیا تھا۔

ہم خوشی خوشی آگے چلے۔ کچھ دُور چل کر چٹان کی جڑ میں بانس کا ایک جھنڈ ملا۔ بیس بیس فٹ اونچے، نوکیلے بانس برچھوں کی طرح کھڑے تھے۔ گُنجان جھنڈ کا چکر لگاتے ہوئے اچانک میری نظر جھنڈ کے درمیانی حصّے پر پڑی۔ کوئی سفید سفید چیز نظر آ رہی تھی۔ ہم نے غور سے دیکھا تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ یہ ایک انسانی ڈھانچا تھا اور پورے کا پورا آپس میں جُڑا ہوا تھا۔ صرف کھوپڑی الگ ہوگئی تھی جو کچھ فاصلے پر پڑی تھی۔

ہم نے کلہاڑیوں سے بانس صاف کیے اور وہاں تک پہنچے۔ ڈھانچے کے آس پاس چند چیتھڑے تھے جو کبھی اُس کا لباس رہے

ہوں گے۔ پیروں میں بوٹ تھے جو سوکھ کر پتھر کی طرح سخت ہوگئے تھے۔ ان سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی یورپی نسل کا آدمی تھا۔ سنہری گھڑی، قلم اور چاندی کا سگرٹ لائیٹر بھی پڑا ہوا تھا۔ جس پر "ج۔ک" کھدا ہوا تھا۔ اِن چیزوں کی حالت بتا رہی تھی کہ اِنھیں یہاں پڑے بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔

"یہ کون بدنصیب ہو سکتا ہے؟" لارڈ جان نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

پروفیسر چیلنجر نے کہا۔ "پارا میں میں نے چھان بین کی تھی تو پتا چلا تھا کہ میپل وہائیٹ کے ساتھ ایک اور امریکی تھا جس کا نام جیمز کولور تھا۔"

اب 'ج۔ک' کا مطلب واضح تھا۔ یقیناً یہ جیمز کولور ہی کا ڈھانچا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اس کی موت کس طرح ہوئی۔ بانس اس کے ڈھانچے کو پروئے ہوئے تھے جس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اُوپر سے گرا ہے۔ پھر ہڈیاں بھی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں جو ایک ہزار فٹ کی بلندی سے پتھروں پر گرنے کا ثبوت تھا۔ ہم نے اُوپر دیکھا۔ پہاڑی کا اُوپر کا سرا باہر کی طرف جھکا ہوا تھا۔ مجھے ایک جھرجھری سی آئی اور خوف کی ایک لہر ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔

لارڈ جان نے کہا۔ "وہ وہاں سے گرا ہے یا کسی نے اُسے گرا کر پھینک دیا ہے؟"

یہ سن کر سب چپ ہوگئے۔ کوئی پانچ میل چلنے کے بعد ہماری آس پھر تازہ ہوگئی۔ چٹان کے ایک گڑھے کے اندر، جہاں بارش کا پانی نہیں پہنچ سکتا تھا، چاک سے تیر کا نشان بنا ہوا تھا اور اس کی نوک مغرب کی طرف تھی۔

"یہ بھی میل وہائیٹ کا کام ہے۔ اسے یقین تھا کہ کوئی ضرور یہاں پہنچے گا۔" چیلنجر نے کہا اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے سامان میں مجھے چاک کے ٹکڑے بھی ملے تھے۔

کوئی پانچ میل اور چلنے کے بعد تیر کا ویسا ہی ایک اور نشان یہ اس جگہ تھا جہاں چٹان میں ایک شگاف تھا۔ شگاف کے اندر ایک اور تیر بنا ہوا تھا جس کی نوک اوپر کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ یہ شگاف اتنا تنگ تھا کہ اس میں سے ایک آدمی بمشکل گزر سکتا تھا اور دونوں طرف کی دیواریں بلند ہونے کی وجہ سے اندر بالکل اندھیرا تھا۔

ہم اگرچہ تھک چکے تھے اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ پھر بھی نے وہاں کیمپ لگانے کا حکم دیا اور ہم چار آدمی، صرف دو ملازموں کو ساتھ لے کر اس شگاف کے اندر جا گھسے۔

آگے جا کر شگاف کی سطح اچانک بلند ہوگئی۔ اس سے آگے جانا ممکن نہ تھا۔ کوئی پاؤ میل چلنے کے بعد راستہ بند ہو جانے ہم نے سمجھا کہ شاید ہم اصل راستہ چھوڑ کر آگے آ گئے ہیں۔ اس

واپس ہوگئے۔ واپسی میں ایک جگہ لارڈ جان کی تیز نگاہوں نے دیکھا کہ قدِ آدم بلندی پر چٹان پر ایک گول سا دھبا ہے۔ یہ کسی غار کا منہ تھا جو اندھیرے میں دھبا سا لگ رہا تھا۔

نیچے پتھر بکھرے ہوئے تھے جنھیں ڈھیر کر کے اتنا اونچا کیا جا سکتا تھا کہ ان پر چڑھ کر غار تک پہنچا جا سکے۔ لارڈ جان کے پاس ایک چھوٹی سی ٹارچ تھی وہ انھوں نے نکال لی۔ ہم نے پتھر جمع کیے اور ایک ایک کر کے غار میں داخل ہوگئے۔ اندر بہت سیلن تھی۔ دیواریں پھسلواں تھیں اور فرش پر چھوٹے چھوٹے گول اور چپٹے پتھر بچھے تھے۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ ہمیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا۔ پچاس گز تک راستہ سیدھا چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اچانک چڑھائی شروع ہوگئی جو اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں ہاتھ پیروں کے بل آگے بڑھنا پڑ رہا تھا۔ پیروں کے نیچے سے چکنے پتھر پھسل پھسل جاتے مگر ہم سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے رہے۔ لارڈ جان آگے تھے اور ان کی ننھی سی ٹارچ ہمیں راستہ بتا رہی تھی کہ اچانک وہ رک گئے اور ان کی آواز سنائی دی۔

"آگے راستہ بند ہے۔"

ہم نے ان کی بغل میں سے جھانک کر دیکھا۔ چقماق کے پتھروں کا ڈھیر چھت تک لگا ہوا تھا۔ غالباً چھت گر پڑی تھی۔ ہم نے پتھر ہٹائے تو ان کی جگہ دوسرے پتھر کھسکتے ہوئے آ گئے اور

خطرہ پیدا ہوگیا کہ ہم خود پتھروں کے ملبے میں نہ دب جائیں۔ میپل وائٹ
کا دریافت کیا ہوا راستہ شاید زلزلے یا کسی اور سبب سے بند
ہوگیا تھا۔ آخر ہمیں واپس ہونا پڑا اور مایوسی نے تھکن کا احساس
دس گنا بڑھا دیا۔

جونہی ہم شگاف سے باہر نکلے ایک بہت بڑا پتھر آ کر گرا اور ہم
لوگ بال بال بچ گئے۔ ہم نے اوپر دیکھا مگر وہاں بالکل خاموشی تھی
جس کا مطلب یہ تھا کہ کسی نے جان بوجھ کر ہمیں نشانہ بنانے کی
کوشش کی تھی یعنی اوپر کوئی انسان موجود تھا۔ ہم سب سوچ میں پڑ
گئے۔

کیمپ واپس پہنچ کر ہم نے صورتِ حال پر غور کیا اور اس نتیجے
پر پہنچے کہ مغرب کی جانب سفر جاری رکھا جائے۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے
تھے کہ چھوٹی نسل کا ایک جنگلی جانور بھاگتا ہوا گزرا۔ لارڈ جان نے
پھرتی سے بندوق اٹھا کر داغ دی اور اسے گرا لیا۔ آدھا تو ہم نے
ملازموں کو کھانے کے لیے دے دیا اور باقی آدھے کو ایک لکڑی
میں پرو آگ پر اپنے لیے سینکنے لگے۔

اچانک ایسی آواز آئی جیسے کوئی ہوائی جہاز اڑتا ہوا نیچے
آ گیا ہو۔ پھر بغیر بال یا روئیں والے چمڑے کے پر، ہم سب پر چھا گئے۔
مجھے تو اتنا یاد ہے کہ اس پرندے کی گردن سانپ جیسی تھی۔ خوفناک
سرخ لالچی آنکھیں تھیں اور منہ میں سفید باریک دانتوں کی لمبی قطار

تھی۔ دوسرے لمحے پرندہ غائب ہوگیا اور ساتھ ہی وہ مزے دار
گوشت بھی جو ہم بھون رہے تھے۔ ہم چاروں گم سم بیٹھے رہ گئے
سب سے پہلے سمرلی نے خاموشی توڑی اور بڑی سنجیدگی سے بھرائی
ہوئی آواز میں کہا۔

"مجھے معاف کر دیجیے پروفیسر چیلنجر۔ میں غلطی پر تھا۔ امید ہے کہ آپ
پچھلی باتیں بھول جائیں گے۔"

پروفیسر چیلنجر نے جلدی سے سمرلی سے ہاتھ ملا لیا۔ اس طرح ہم نے
پہلی مرتبہ ٹیروڈکٹائل پرندہ دیکھا۔ کھانے سے محروم رہ جانے کا اس
لیے افسوس نہ تھا کہ اسی بہانے ہمارے دو ساتھی آپس میں دوست
بن گئے۔

پھر بھی ہم سب کا خیال تھا کہ سطح مرتفع پر اگر پرانے زمانے کے
جانور ہیں بھی تو ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اگلے تین روز تک
ہم نے کوئی جانور نہیں دیکھا۔ اس عرصے میں ہم نے ایک طویل چکر
لگایا۔ پتا چلا کہ سطح مرتفع کے ایک طرف دلدل ہے جس میں طرح
طرح کی چڑیاں اور زہریلے سانپ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک
ریگستان ہے جہاں کوئی جاندار نہیں۔ بہر حال چڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہ
آیا۔

میں نے کہا سطح مرتفع پر بارش ہوتی ہوگی اور پانی بہہ کر نیچے
بھی ضرور آتا ہوگا۔ اس لیے پانی نے چٹانیں کاٹ کر کوئی راستہ

ضرور بنا دیا ہوگا۔"

پروفیسر چیلنجر نے کہا: "اسے کہتے ہیں عقل بڑی کہ بھینس۔ ابھی ہم نے خود دیکھ لیا کہ کوئی راستہ نہیں ہے۔ پھر عقل لڑانے سے کیا حاصل۔ پانی تو کسی جھیل میں بھی جمع ہو سکتا ہے۔"

اس پر سمرلی نے کہا۔ "اگر اوپر کوئی جھیل ہے تو وہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے بنائے ہوئے وسیع گڑھے میں ہوگی اور بہت ممکن ہے کہ پانی وہیں سے رِس رِس کر دلدل میں پہنچ رہا ہو۔"

"یا پھر جتنا پانی برستا ہو بھاپ بن کر اڑ جاتا ہو۔" چیلنجر نے خیال ظاہر کیا اور ہم لوگ بڑی دیر تک ان دونوں عالموں کی باتیں سنتے رہے جو ہمارے پلے نہ پڑیں۔

چھ دن بعد پوری سطح مرتفع کے گرد چکر لگا کر ہم تھکے ہارے اپنے کیمپ میں واپس آ گئے۔ اب اوپر چڑھنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ وہ راستہ جو میپل وہائیٹ نے اختیار کیا تھا اب بند ہو چکا تھا۔ ہمارے پاس کھانے پینے کے سامان اور کارتوسوں کی کمی نہ تھی۔ لیکن کوئی دو مہینے بعد برسات شروع ہونے والی تھی۔ اگر ہم ان سخت چٹانوں کو کاٹ کاٹ کر راستہ بناتے تو دو مہینے میں پورے کام کا دسواں حصہ بھی مکمل کرنا مشکل تھا۔

ایک روز ہم کمبل اوڑھ کر سونے کے لیے لیٹے تو میں نے دیکھا کہ چیلنجر کسی موٹے مینڈک کی طرح آگ کے پاس دو زانو بیٹھے ہوئے

ہیں۔ اُن کا سر مایوسی سے سینے پر جھکا ہوا تھا۔

لیکن صبح کو ہم سو کر اُٹھے تو ایک دوسرا ہی چیلنجر نظر آیا۔ اُن کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔ ناشتے پر انھوں نے کہا: "دوستو، مجھے مبارک باد دو۔ بلکہ سب ہی کو مبارک ہو۔ مسئلہ حل ہو گیا۔"

"وہ کیسے؟" ہم نے پوچھا جس پر چیلنجر نے اس نوکیلی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا جو اصل سطح مرتفع سے کٹ کر الگ ہو گئی تھی۔ یہ دیکھ کر ہمارے چہرے جو لمحہ بھر پہلے بشاش ہو گئے تھے پھر ماند پڑ گئے۔ لارڈ جان نے کہا۔

"مان لیا کہ اس پہاڑی پر چڑھا جا سکتا ہے لیکن فائدہ کیا؟ اس کی چوٹی سطح مرتفع سے اتنی دور ہے کہ ہم کسی طرح وہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"اوپر پہنچ کر میں بتاؤں گا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جسے انسانی ذہن حل نہ کر سکے۔" چیلنجر نے کہا اور ہم خاموش ہو گئے۔

ناشتے کے بعد ہم نے کوہ پیمائی کا سامان کھولا۔ اس میں سے سب سے مضبوط اور سب سے ہلکی رسّی نکالی جو ڈیڑھ سو فٹ کے لگ بھگ ہوگی۔ کدالیں اور دوسرا سامان بھی لیا۔ لارڈ جان کو کوہ پیمائی کا خاصا تجربہ تھا۔ سمرلی بھی اناڑی نہیں تھے۔ چیلنجر تو ہر فن مولا تھے ہی۔ لے دے کے ایک میں ہی پھسڈی تھا۔ بہرحال

چڑھائی شروع ہوئی۔ شروع میں یہ کام آسان نکلا لیکن کبھی کبھی ایسے لمحے ضرور آئے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل کی حرکت بند ہوتی محسوس ہونے لگی۔ آدھا راستہ طے ہو گیا تو چڑھائی بہت مشکل شروع ہو گئی اور آخری پچاس فٹ تو ہم نے انگلیوں کے بل لٹک لٹک کر اور چھوٹی چھوٹی گگروں پر صرف پنجے ٹکا کر طے کیے۔ بلکہ مجھے تو یہ کہنے میں بھی باک نہیں کہ چیلنجر نے، جو سب سے پہلے اوپر پہنچے تھے، مجھے اور سمرلی کو کھینچ کر وہاں پہنچایا ورنہ ہم لوگ کبھی نہ چڑھ سکتے۔

اس مخروطی پہاڑی کی چوٹی کوئی پچیس فٹ قطر کی تھی۔ اس پر گھاس اگی ہوئی تھی اور کنارے کے پاس ایک مضبوط لمبا درخت تھا۔ ہوش ٹھکانے آنے کے بعد جو چیز سب سے پہلے میں نے دیکھی وہ نیچے کا خوش نما منظر تھا۔ برازیل کا پورا میدان نظر آ رہا تھا۔ میں ابھی اس منظر سے لطف اٹھا ہی رہا تھا کہ پروفیسر چیلنجر کا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر پڑا۔

"ادھر دیکھو میرے دوست، پیچھے مڑ کر دیکھنا بزدلی ہے۔ نظر ہمیشہ منزل کی طرف رکھو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا تو سطح مرتفع میرے بالکل سامنے تھی اور اس کی بلندی مخروطی پہاڑی کے بالکل برابر تھی۔ اسے اتنا قریب پا کر یقین نہ آ رہا تھا کہ اس پر چڑھنے کی خاطر ہم نے کیا کیا جتن کیے

تھے اور پھر ناکام رہے تھے۔ دونوں کا فاصلہ کوئی چالیس فٹ رہا ہوگا۔ میں نے ایک ہاتھ درخت کے گرد ڈال دیا اور جھک کر دیکھا۔ نیچے ہمارے ملازم ننھے ننھے کھلونے جیسے نظر آ رہے تھے۔ مجھے چکر سا آنے لگا اور میں فوراً سیدھا ہو کر سنبھل گیا۔

اتنے میں پروفیسر چیلنجر کی آواز آئی: "یہ درخت دیکھا——؟"

میں نے جلدی سے درخت کو غور سے دیکھا۔ چکنی چھال اور ابھری ہوئی رگوں والے چھوٹے چھوٹے پتّے —— بلاشبہ یہ سفیدے کا درخت تھا۔ اپنے وطن کے درخت کو یہاں دور پردیس میں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چیلنجر نے کہا۔

"اس درخت کا ہمارے ملک سے رشتہ ہے اور یہی ہماری مشکل بھی حل کرے گا۔"

"کیا اسی کا پل بنے گا؟" —— لارڈ جان نے مارے خوشی کے چیخ کر کہا اور ہم سب کی مایوسی آس میں بدل گئی۔

چیلنجر نے ڈینگ ماری: "چیلنجر کو اس وقت ترکیب سوجھتی ہے جب کوئی امید باقی نہ رہے۔ رات ہم مایوس تھے لیکن صرف میرے دماغ نے کام کیا اور آخر اس مسئلے کا حل ڈھونڈ ہی نکالا۔"

"کیا کہنے ہیں تمھارے دماغ کے۔" سمرلی نے داد دی۔

چیلنجر اپنے کندھے پر ایک کلہاڑی لٹکا کر لائے تھے۔ اب انھوں نے وہ کلہاڑی اتار کر مجھے دی اور کہا: "صاحبزادے۔ تم ہم

سب میں جوان اور جاندار ہو۔ یہ سنبھالو اور جس طرح میں کہوں اُس طرح درخت کو کاٹو۔"

درخت قدرتی طور پر سطحِ مرتفع کی جانب ہی جھکا ہوا تھا۔ اُس کی اُونچائی کوئی ساٹھ ستر فٹ تھی۔ گویا طریقے سے گرایا جاتا تو اچھا خاصا پل بن جاتا۔ چیلنجر جہاں جہاں بتاتے رہے، میں کلہاڑی سے نپی تلی چوٹ مارتا رہا۔ جب میں تھک گیا تو کلہاڑی لارڈ جان نے سنبھال لی۔ یونہی باری باری ہم درخت کاٹتے رہے۔

اچانک درخت ایک زوردار چرچراہٹ کے ساتھ گرا اور اُس کی ٹہنیاں سطحِ مرتفع کی گھنی جھاڑیوں میں اُلجھ گئیں۔ گرتے ہوئے اُس کا کٹا ہوا حصہ بھی کنارے کی طرف لڑھکا اور ایک لمحے کے لیے تو ہمیں یہ خدشہ پیدا ہوگیا کہ درخت نیچے جا گرے گا اور ہماری ساری محنت اکارت جائے گی لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ کگر سے چند انچ ادھر ہی رُک گیا اور اِس طرح اس نامعلوم دنیا سے ہمارا تعلق قائم ہوگیا۔

ہم سب نے ایک لفظ کہے بغیر باری باری چیلنجر سے ہاتھ ملایا اور انھوں نے بھی اپنا تنکوں والا بچگانہ ہیٹ اتار کر جھک جھک کر ایک ایک کا شکریہ ادا کیا۔ اِس کے بعد وہ بولے "نئی دنیا میں پہلا قدم رکھنے کا فخر بھی مجھی کو حاصل ہونا چاہیے۔"

"ٹھہریے جناب" یہ لارڈ جان کی آواز تھی۔ انھوں نے درخت

کی جانب بڑھتے ہوئے پروفیسر کا کندھا پکڑ کر انھیں روک لیا تھا۔ پروفیسر چیلنجر کا سر پیچھے کی طرف ڈھلکا اور داڑھی آگے نکل آئی جو ان کے غصے کی مخصوص علامت تھی۔ لارڈ جان نے کہا۔

"جناب جہاں تک سائنس کا معاملہ ہے میں آپ کو رہنما مانتا ہوں اور آپ کے پیچھے آنکھ بند کر کے چلنے کو تیار ہوں لیکن جب میرے شعبے کا سوال پیدا ہو تو آپ کو میرے پیچھے چلنا چاہیے۔"

"آپ کا شعبہ؟" چیلنجر نے چنگھاڑ کر کہا جس پر لارڈ جان بولے۔

"ہم ایک نئے ملک پر چڑھائی کر رہے ہیں۔ ممکن ہے یہاں دشمن موجود ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آدم خور ان بڑی بڑی جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہوں۔ اِس لیے ہمیں ان کی خوراک بننے سے پہلے دُور اندیشی سے کام لینا چاہیے۔"

"آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟" چیلنجر نے بے بسی سے پوچھا۔ جس کے جواب میں لارڈ جان نے کہا۔

"میں اور میلون دوبارہ نیچے جائیں گے اور وہاں سے چار رائفلیں اور گومز اور دُوسرے لوگوں کو لے کر واپس آئیں گے۔ اس کے بعد ایک آدمی پل پار کر کے اس طرف جائے گا اور ہم سب یہاں رائفلیں تانے اُس کی حفاظت کے لیے تیار کھڑے رہیں گے۔"

پروفیسر چیلنجر کٹے ہوئے درخت کے سرے پر بیٹھ کر بڑبڑانے لگے میرا اور سمرلی کا خیال تھا کہ جہاں اِتنی احتیاط درکار ہو وہاں لارڈ جان

ہی کو رہنما ہونا چاہیے۔"

چنانچہ کثرتِ رائے سے اس مسئلے کا فیصلہ کیا گیا اور لارڈ جان نیچے اُتر آئے۔ رسّی درخت کی جڑ میں بندھی رہی۔ ہم نے نہ صرف بندوقیں اور سارے کارتوس لیے بلکہ کھانے پینے کے سامان کی گٹھڑیاں اور تھیلے بھی لے لیے۔ اور دوبارہ اُوپر پہنچ گئے۔

"مسٹر چیلنجر، اب چونکہ سارے انتظامات مکمل ہیں۔" لارڈ جان بولے۔ "اِس لیے اِس نامعلوم دُنیا میں پہلا قدم رکھنے کا اعزاز آپ ہی حاصل کریں۔"

یہ سُن کر چیلنجر اتنے خوش ہوئے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اُنھوں نے جُھک جُھک کر سلام کیے اور شکریہ ادا کیا۔ پھر درخت پر دونوں جانب ٹانگیں لٹکا کر بیٹھنے کے بعد کھسکنا شروع کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ کر پُکار کر کہا: "آخر کار ہم نے پالا مار ہی لیا۔"

میرا خیال تھا کہ چیلنجر کے پیچھے ابھی کوئی درندہ یا وحشی جھاڑیوں سے نکلے گا مگر کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ البتہ رنگ برنگے پروں والی ایک چھوٹی سی چڑیا اُس کے قدموں کے پاس کی جھاڑیوں سے نکل کر اُڑ گئی۔

اب سمرلی پار اُترے۔ وہ اپنے ساتھ دو را ئفلیں لے گئے تھے تاکہ ایک چیلنجر کو دے دیں۔ اِس کے بعد یہ مہم میں نے سر کی اور اِس کی احتیاط کی کہ کہیں نیچے نظر نہ پڑ جائے ورنہ میرا تو سر ہی چکرا جاتا۔

جب میں اُس کنارے پر پہنچ گیا تو سمرلی نے پہلے اپنی بندوق مجھے تھما دی اور جب اُس کا سہارا لے کر میں اور قریب پہنچا تو اُنھوں نے ہاتھ دے کر مجھے کھینچ لیا۔ میں نے حیرت سے دیکھا کہ لارڈ جان کھڑے ہو کر اطمینان سے اس چالیس فٹ لمبے لٹھے پر چلتے ہوئے آ رہے ہیں۔

گویا اب ہم چاروں اُس نامعلوم دُنیا میں پہنچ چکے تھے جس کو دریافت دراصل میپل وہائیٹ نے کیا تھا لیکن اس کے اندر قدم رکھنا ہمارے نصیب میں تھا۔ مگر فتح مندی کا یہ لمحہ ہی ہماری تباہی کا آغاز تھا۔ ہم مخروطی پہاڑی کی طرف پیٹھ کر کے گنجان جھاڑیوں میں بمشکل پچاس گز گئے ہوں گے کہ پُشت کی جانب سے کسی بہت وزنی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ ہم دوڑ کر کنارے پر واپس آ گئے۔ آخر وہی ہُوا جس کا ڈر تھا ——— ہمارا پُل غائب تھا۔ میں نے جُھک کر دیکھا تو اِتنی بُلندی سے گِرنے کی وجہ سے مضبُوط تنے کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔

درخت مخروطی پہاڑی کے کنارے پر ذرا سا لٹکا ہُوا تھا اُس کا کنارہ ٹُوٹ گیا اور وہ گر پڑا لیکن اُسی لمحے مخروطی پہاڑی پر سے گومز کی آواز سُنائی دی وہ چلّا رہا تھا۔

"لارڈ روکسٹن ——— لارڈ جان روکسٹن!"

"کیا ہے؟" لارڈ جان نے کہا جس کے جواب میں گومز نے قہقہہ لگا کر کہا: "انگریز کُتّے۔ اب تم وہیں رہو ——— میں بہت دن سے موقع کی

تلاش میں تھا۔ یہاں چڑھنا مشکل تھا لیکن اب اُترنا ناممکن ہے۔ خوب پھنسے ہو تم۔"

ہم سب اس واقعے پر ہکابکا رہ گئے تھے اور سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ ہوا کیا؟ اتنے میں گومز نے پھر کہا: "غار سے نکلتے وقت میں نے تم پر پتھر پھینکا تھا لیکن تم بچ گئے۔ خیر اچھا ہی ہوا۔ اب تم تڑپ تڑپ کر مرو گے۔ بسک بسک کر جان دو گے۔ تمھاری ہڈیاں تک کسی کو نہیں ملیں گی اور جب تم مرنے لگو تو کوپز کو یاد کر لینا جسے پانچ برس ہوئے تم نے گولی مار دی تھی۔ وہ میرا بھائی تھا۔ آج میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا ہے۔"

گومز نے یہ جملہ رسّی میں لٹک کر مخروطی پہاڑی پر سے صرف اپنا سر نکال کر کہا تھا اور اس کے بعد وہ تیزی سے نیچے اُتر گیا۔ اپنے خیال میں وہ بالکل محفوظ تھا مگر لارڈ جان نشانے بازی میں تین برّاعظموں کے چیمپین تھے۔ انھوں نے بندوق اُٹھا کر شست باندھی اور دوسرے ہی لمحے کٹے ہوئے درخت کی جڑ میں بندھی ہوئی رسّی کو اُڑا دیا۔ گومز کی وہ چیخ مجھے زندگی بھر یاد رہے گی۔ بلاشبہ اُسے اپنی شرارت کی سزا مل گئی تھی لیکن ہماری واپسی کا راستہ بہرحال بند ہو گیا تھا۔

لارڈ جان نے کہا۔

"گومز اتنے بڑے درخت کو اکیلا نہیں گرا سکتا تھا۔ مینوئل اس کے ساتھ ہو گا۔ افسوس وہ میرے ہاتھ سے بچ گیا۔"

ابھی ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ سمرلی نے نیچے میدان کی طرف اشارہ کیا اور ہم نے دیکھا کہ مینوئل بے تحاشا بھاگ رہا ہے جیسے موت اس کا پیچھا کر رہی ہو اور پھر ہم نے دیوقامت زمبو کو اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔ زمبو نے جلد ہی مینوئل کو جا لیا اور گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ اس کے بعد زمبو بھاگا ہوا سطح مرتفع کے قریب آیا اور ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں اپنا کارنامہ بتانے لگا۔

دونوں غدار اپنے کیے کی سزا پا چکے تھے لیکن ہم اس سطح مرتفع پر قید ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے نیچے نظر ڈالی۔ دُور تک وہ پیلا پیلا بانسوں کا جنگل تھا جسے ہم نے پار کیا تھا۔ اس کے پیچھے وہ جگہ تھی جہاں ہم نے اپنی کشتیاں چھپائی تھیں۔ اس سے پیچھے وہ علاقے تھے جہاں مہذب لوگ آباد تھے اور ہم اس غیر آباد علاقے میں ان سب سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کٹ گئے تھے۔

نیچے زمبو ہاتھ ہلا ہلا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ ہم نے غور سے سنا تو یہ الفاظ سنائی دیے: "اب میرے لیے کیا حکم ہے؟ آپ جو کہیں میں وہی کروں گا۔"

یہ سوال جتنا آسان تھا اس کا جواب اتنا ہی مشکل تھا۔ زمبو نے پھر کہا: "میں یہاں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔ لیکن یہ مقامی لوگ واپس جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں کورد پوری رہتی ہے۔"

میں نے چلّا کر کہا: "اِن لوگوں کو بس کل تک کے لیے روک لو۔ میں اِن کے ذریعے خط بھیجوں گا۔"

"ٹھیک ہے ـــ" زمبو نے کہا۔ "لیکن میں آپ کے لیے کیا کروں؟"

آخر ہماری ہدایت پر زمبو نے دو تین پتلی لیکن مضبوط رسیاں لیں اور اُنھیں آپس میں باندھ کر مخروطی پہاڑی پر آکے آدھی رسی کا ایک گولا سا بنا کر ہماری طرف پھینک دیا۔ یہ رسّی اتنی مضبوط نہیں تھی کہ ہم اس کا پُل بنا سکتے لیکن اس میں باندھ باندھ کر زمبو نے کارتوسوں کی پیٹیاں، کھانے پینے کا سامان اور دُوسری چیزیں ہم تک پہنچا دیں۔ وہ ایک پیٹی رسّی میں باندھ دیتا اور اُسے جھلا کر ہم کھینچ لیتے۔ پھر آدھی رسّی گولا بنا کر اس تک پھینک دیتے۔ اسی میں شام ہوگئی۔ رات کو ہم اِسی کنارے پر رہے۔ میں ایک چھوٹی سی موم بتّی جلا کر یہ واقعات لکھتا رہا۔ پھر ہم نے کھانا کھایا۔ آگ اس ڈر سے نہیں جلائی کہ نہ جانے اِس کا نتیجہ کیا ہو۔

کل ـــ بلکہ آج (کیونکہ صبح ہو رہی ہے) ہم اس سرزمین کا جائزہ لیں گے۔ نہ جانے میں اگلی قسط کب بھیج سکوں گا اور بھیج بھی سکوں گا یا نہیں۔ زمبو نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ نیچے میدان میں آگ جل رہی ہے اور اُس کے پاس دونوں مقامی باشندے موجود ہیں۔ صبح زمبو اس مخروطی پہاڑی پر آئے گا اور میں یہ کاغذ اُسے دے دوں گا۔ مجھے اب بھی نہیں معلوم کہ ہماری واپسی کس طرح ہوگی۔ اگر پاس

سطح مرتفع پر اس کنارے کوئی بڑا درخت ہوتا تو ہم اُسے گرا کر پُل بنا لیتے۔ مگر پچاس گز تک کوئی ایسا درخت نہیں ہے۔ صرف جھاڑ جھنکاڑ ہیں۔ ہم چار آدمیوں میں مِل کر بھی اتنی طاقت نہیں کہ دُور سے کوئی درخت کاٹ کر اور اُسے گھسیٹ کر کنارے پر لائیں اور اگر لے بھی آئیں تو کسی سہارے کے بغیر چالیس فُٹ چوڑے اِس خلا کو اس سے پاٹنا ویسے بھی ناممکن ہے۔ ہمارے پاس جو رسّی ہے وہ بھی اتنی لمبی نہیں کہ اس کے سہارے ہزار فٹ کی بلندی سے اُترا جا سکے۔ غرض مایوسی ہی مایوسی ہے۔

حیرت، تعجب

حیرت — اچنبھا — تعجب — عجوبہ — غرض اس قسم کے جتنے الفاظ دُنیا کی زبانوں میں ہیں۔ ان سب کو استعمال کرنے کے بعد بھی میں اپنے وہ محسوسات ظاہر نہیں کر سکتا جو اس عجیب و غریب دُنیا کو دیکھنے کے بعد پیدا ہُوئے۔ میرے پاس صرف پانچ کا پیاں، چند سادہ کاغذ اور صرف ایک پنسل ہے۔ جب تک یہ چیزیں ساتھ دیں گی میں لکھتا رہوں گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہمیں اپنا مُستقبل تاریک نظر آ رہا ہے اور مرنے سے پہلے میں یہاں کے زیادہ سے زیادہ حالات لکھ دینا چاہتا ہُوں۔ ابھی زمبو نیچے میدان میں موجُود ہے۔ وہ یہ کاغذ لے جائے گا یا اگر کوئی معجزہ ہو گیا اور ہم لوگ نیچے اُتر سکے تو ہم خُود لے جائیں گے۔ یا پھر شاید کبھی کوئی بھُولا بھٹکا ہمت والا سیاح چھوٹا سا ہوائی جہاز لے کر اِدھر آ گیا تو یہ معلُومات اُس کے کام آئیں گی۔

ہاں تو جس دن اس کم بخت گومز نے سطح مُرتفع پر ہمیں قید کیا تھا

اُس کے دُوسرے دن ہمارے لیے حیرت انگیز اور ایک سے ایک انوکھے تجربوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلا تجربہ تو یہ ہُوا کہ صُبح ہوتے ہوتے میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ کھُلی اور میری نظر اپنی ٹانگوں پر پڑی۔ پتلون اُوپر کھسک گئی تھی اور جہاں موزہ ختم ہوتا تھا اس سے ذرا اُوپر اُودے رنگ کا ایک بڑا سا گول کیڑا بیٹھا ہُوا تھا۔ میں نے گھبرا کر اُسے انگوٹھے اور کلمے کی اُنگلی سے نوچا تو وہ پچک گیا اور خُون کے چھینٹے اِدھر اُدھر اُڑے۔ بے اختیار میرے مُنہ سے چیخ نکل گئی جسے سُن کر چیلنجر اور سمرلی دونوں میرے پاس آ گئے۔ مگر بجائے ہمدردی کرنے کے انھوں نے مجھے مُبارک باد دی کہ اس نئی سرزمین پر سب سے پہلے مجھے کسی جاندار کا نشانہ بننا پڑا۔

چیلنجر نے کہا: "تمھارا نام سائنس کی تاریخ میں درج کیا جائے گا:"

"بھاڑ میں جائے تمھاری سائنس۔" میں نے جل کر کہا۔ اس پر چیلنجر نے کہا کہ میں سائنس کے بارے میں آیندہ کبھی توہین آمیز باتیں نہ کروں۔ اُس نے کہا۔

"یہ کیڑے تو ایک رحمت ہیں۔"

"ایک رحمت ابھی ابھی تمھارے گریبان میں داخل ہُوئی ہے۔" سمرلی نے کہا اور چیلنجر نے پاگلوں کی طرح اُچھلنا اور گریبان نوچنا شروع کر دیا۔ جیکٹ اور قمیص اُتاری گئی تو ایک رینگنے والا بال دار پڑا، کھلا، برآمد ہُوا جو خُدا جھوٹ نہ بلوائے کوئی ساڑھے چار فُٹ

ملیا تھا۔ چیلنجر کی بوکھلاہٹ پر ہم لوگ خوب ہنسے۔ یہ جگہ طرح طرح کے کیڑوں مکوڑوں سے بھری ہوئی تھی لہٰذا ہم نے یہاں سے ہٹ جانے کا فیصلہ کیا۔

تھوڑی دیر بعد زمبو پھر سامنے والی مخروطی پہاڑی پر آیا۔ وہ اپنے ساتھ کوکو کے ٹین اور بسکٹ لایا تھا۔ یہ سامان اس نے پھینک کر ہم تک پہنچا دیا۔ ہم نے اس سے کہا کہ اب تمہارے پاس جو سامان ہے اس میں سے اپنے لیے دو مہینے کا رکھ کر باقی ان دونوں آدمیوں کو دے دو اور انھیں واپس کر دو۔ یہ گویا میرا خط لے جانے کی اُجرت تھی۔ زمبو نیچے اُتر گیا اور کچھ دیر بعد ہم نے انھیں سامان کی گٹھڑیاں سر پر رکھے واپس جاتے دیکھا۔ اب نیچے ہمارے خیمے میں زمبو اکیلا رہ گیا اور اسی کے ذریعے باقی دُنیا سے ہمارا تعلق قائم تھا۔

ہم وہاں سے ہٹ کر کچھ دُور ایک ایسی جگہ چلے گئے جہاں اونچے اونچے درختوں کے بڑے سے گول حلقے کے درمیان ایک ہموار چٹان تھی۔ اس سے اچھی جگہ ہمیں نہ مل سکتی تھی۔ چاروں طرف چڑیوں کے چہچہانے کے سوا دُوسری آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔ اِن چڑیوں میں ایک رنگین چڑیا ہمارے لیے بالکل نئی تھی۔

سب سے پہلے ہم نے اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ ہم جو سامان اپنے ساتھ لائے تھے اور جو بعد میں زمبو نے پہنچایا۔ وہ بہت کافی تھا۔ اس سامان میں سب سے اہم چیز ہماری چار رائفلیں اور ایک ہزار

تین سو گولیاں تھیں۔ ان کے علاوہ ایک نالی بندوق اور اس کے ڈیڑھ سو سے اوپر کارتوس بھی تھے۔ کھانے پینے کا سامان کئی ہفتے کے لیے کافی تھا۔ تمباکو بہت تھا۔ کچھ سائنسی آلات بھی تھے جن میں چھوٹی بڑی دُوربینیں بھی شامل تھیں۔

ہم نے سب سے پہلے سارا سامان ترتیب سے جمایا اور پھر کانٹوں دار جھاڑیاں کاٹ کر انھیں تلے اُوپر رکھ کر ایک دیوار سی بنا لی جو پندرہ فٹ دائرے میں تھی۔ فی الحال یہی ہماری پناہ گاہ تھی۔ اس کا نام ہم نے "فورٹ چیلنجر" رکھ دیا۔ ایک درخت جو سب سے لمبا تھا اس کی گھنی شاخیں فورٹ چیلنجر پر سایہ کیے ہوئے تھیں۔

چیلنجر نے سب کو ہدایت دی کہ بلا ضرورت کوئی اس قلعے کے باہر نہ نکلے۔ علاقے کا جائزہ لینے کے لیے سوچ سمجھ کر جایا جائے گا۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکے ہم اس قلعے کے قریب رہیں۔ لارڈ جان نے یہ ہدایت دی کہ شدید ضرورت کے بغیر کوئی گولی نہ چلائے۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اس دُنیا کا نام کیا رکھا جائے؟ کئی تجویزیں پیش ہوئیں۔ آخر میں پروفیسر کی اس تجویز سے سب نے اتفاق کیا کہ چونکہ سب سے پہلے اس کا پتا میپل وہائیٹ نے لگایا ہے اس لیے اسے میپل وہائیٹ لینڈ کہا جائے۔

اب تک ہمارے تجربے کے مطابق یہ جگہ تقریباً غیر آباد تھی لیکن میپل وہائیٹ کی خاکوں کی کتاب کے مطابق یہاں حیرت انگیز جانور

موجود تھے۔ پھر ہمیں بانسوں کے جھنڈ میں اُلجھا ہُوا جو انسانی ڈھانچا ملا تھا اس سے بھی شبہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کوئی آدمی بھی موجود ہے گویا ہمارے لیے سخت خطرات تھے۔

علاقے کا جائزہ لینے کا شوق اتنا شدید تھا کہ ہم نے کانٹے دار جھاڑیوں سے اپنے قلعے کا دروازہ بند کر دیا اور خود باہر نکل پڑے۔ سامنے ایک چشمہ تھا۔ ہم نے طے کیا کہ اس چشمے کے کنارے کنارے چلے جائیں گے تاکہ واپسی میں راستہ بھولنے کا امکان نہ رہے۔

چشمے کے دونوں طرف گھنے جنگل تھے جن میں طرح طرح کے درخت تھے۔ پروفیسر چیلنجر ماہر نباتات بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ان میں کئی درخت ایسے ہیں جو ہزاروں برس پہلے دُنیا میں ہوتے تھے لیکن اب ختم ہو چکے ہیں۔ اچانک لارڈ جان کی آواز سُنائی دی۔

"ارے یہ دیکھو۔ یہ کسی پرندے کے پیروں کے نشان ہیں مگر خدا کی پناہ کس قدر بڑے ہیں یہ نشان۔"

تین اُنگلیوں والے پنجوں کے یہ نشان جو کیچڑ میں بن گئے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا تھا کہ پرندے نے دلدلی چشمہ پار کیا تھا اور جنگل میں داخل ہُوا تھا۔

"شُتر مُرغ کے پنجے کے مقابلے میں یہ پنجہ چوگنا بڑا ہو گا۔ اسی سے اس کے قد کا اندازہ کر لو۔" لارڈ جان نے کہا۔

"مگر اس کے ساتھ چھوٹے نشان بھی ہیں۔" سمرلی نے کہا۔ "یہ نشان

ہلکے تھے اس لیے دیر میں نظر آئے۔"

اچانک لارڈ جان نے ایک نشان کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا "دیکھو یہ پانچ اُنگلیوں والا پنجہ ہے۔"

اُسے دیکھ کر چیلنجر نے چیخ کر کہا "ڈیلڈن میں جو کھدائی ہوئی ہے اس کے دوران ایسے نشان برآمد ہو چکے ہیں۔ یہ پرندہ نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہے؟" لارڈ جان نے پوچھا۔

"یہ ایک ایسا جانور ہے جو تین اُنگلیوں والے پنجوں کے بل سیدھا چلتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اپنا پانچ اُنگلیوں والا پنجہ بھی زمین پر ٹکا دیتا ہے۔"

"کوئی چوپایہ؟"

"جی نہیں — رینگنے والا جانور — ڈینوسار۔"

یہ بات سُن کر ہم سب سہم گئے۔ گویا وہ عظیم اور ہیبت ناک جانور جو دُنیا میں ہزاروں سال ہُوئے ختم ہو چکا ہے، یہاں موجود تھا۔

ہم آگے بڑھے اور کچھ درختوں سے نکل کر جھاڑیوں میں آ گئے۔ جھاڑیوں کے بعد ایک چھوٹا سا میدان تھا اور اس میدان میں پانچ عجیب و غریب جانور کھڑے تھے۔ ہم جھاڑیوں میں چھپے اطمینان سے انھیں دیکھتے رہے۔ وہ مزے سے دُھوپ سینک رہے تھے۔ ان میں دو بڑے تھے اور تین بچے۔ بچوں کا قد ہاتھی جتنا تھا اور بڑے تو اتنے بڑے تھے کہ دُنیا میں اتنے بڑے کسی جانور کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اُن

کارنگ سلیٹی تھا اور جسم پر دھاریاں پڑی ہوئی تھیں جو دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ اُن کی دُم بہت موٹی اور لمبی تھی اور وہ پچھلے پیروں کے بل اکڑوں بیٹھے ہوئے تھے۔ پچھلے پیروں کے پنجوں میں تین تین انگلیاں تھیں اور اگلے پیروں یا ہاتھوں کے پنجوں میں پانچ پانچ۔ میں اُن کی شکل کے بارے میں اتنا ہی بتا سکتا ہوں کہ وہ کنگروؤں سے ملتے جلتے تھے مگر قد میں بیس فٹ سے اونچے تھے۔ اور اُن کی دُم مگرمچھ کی سی تھی۔

خدا جانے ہم کتنی دیر کھڑے انھیں دیکھتے رہے۔ ہوا اُن کی طرف سے ہماری طرف چل رہی تھی اِس لیے اس کا خطرہ نہیں تھا کہ وہ ہماری بو سونگھ لیں۔ بچے آپس میں کھیل رہے تھے اور اچھل اچھل کر دھما دھم گر رہے تھے۔ بڑے اپنے اگلے پنجوں سے درختوں کے پتے توڑ توڑ کر کھا رہے تھے۔ ایک جانور کے ہاتھ جب پتے نہیں آئے تو اس نے اُس مضبوط درخت کو اِس طرح گرا لیا جیسے وہ کوئی پودا ہو۔ اس سے جہاں اُس کی حیرت ناک طاقت کا اندازہ ہوا وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس جانور میں ذرا بھی عقل نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ وزنی درخت اُس کے سر پر آ گرا تھا اور وہ تکلیف سے چیخ اُٹھا تھا۔ ان کے بعد چاروں جانور چلے گئے۔

حیرت کے مارے بڑی دیر تک ہم چپ رہے۔ آخر سمرلی نے خاموشی توڑی اور کہا۔ "انگلستان میں لوگ یہ واقعہ سن کر کیا کہیں گے؟"

"یہی کہ تم اوّل نمبر کے جھوٹے اور لپاٹیے ہو۔ جس طرح تم نے میرے بارے میں کہا تھا۔" چیلنجر نے سمرلی کو جواب دیا۔

"اگر ہم انھیں فوٹو دکھائیں تب؟"

"اُن تصویروں کو جعلی کہا جائے گا۔"

"اور اگر ہم کوئی نمونہ لے جا کر انھیں دکھا دیں؟"

"تب دوسری بات ہے۔" چیلنجر نے کہا اور پھر مجھ سے کہنے لگا۔ "ہاں بھئی میلون، لکھو اپنی ڈائری میں کہ 28 اگست کو ہم نے پانچ ایسے جانور دیکھے۔ اور چھپوا دو یہ خبر اپنے اُس چیتھڑے اخبار میں۔"

یہ جانور جو ہم نے دیکھے تھے چونکہ سبزی خور تھے اِس لیے ہمارے لیے بے ضرر تھے لیکن گوشت خور اور درندوں کا وجود بھی ممکن تھا اور یہی بات تھی جس سے ہم بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ مجھے پرانے زمانے کے جانوروں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں لیکن میں نے یہ ضرور پڑھا تھا کہ کسی زمانے میں دُنیا میں ایسے جانور بھی پائے جاتے تھے جو شیر چیتوں کا اِس طرح شکار کرتے تھے جیسے بلی چوہے کا شکار کرتی ہے۔

اب ہم بہت آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ لارڈ جان ہم سے ذرا آگے تھے کیونکہ ان میں شکاری ہونے کی وجہ سے خطرے کی بو سونگھ لینے کی صلاحیت تھی۔ قدم قدم پر چیلنجر اور سمرلی کوئی نئی قسم کا کیڑا یا بھنگا دیکھ کر ٹھہر جاتے اور پھر اس کی نسل اور خاندان کے بارے میں

بحث شروع کر دیتے۔

اب ہم ایک اور چھوٹے سے میدان میں نکل آئے جس میں ایک طرف بہت بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ "میپل وہائیٹ لینڈ" میں ایسے پتھروں کے ڈھیر ہیں جگہ جگہ ملے۔ پتھروں کے اس ڈھیر سے پہلے جھاڑیاں تھیں جو ہمارے سینے تک بلند تھیں۔ جھاڑیوں میں سے ہو کر جب ہم پتھروں کے پاس پہنچے تو اچانک بطخوں سے ملتی جلتی تیز آواز سنائی دی جس کے ساتھ سیٹیاں سی بھی بج رہی تھیں۔ یہ آواز ہمارے بالکل قریب سے آ رہی تھی سلارڈ جان نے فوراً ہاتھ سے اشارہ کیا جس پر ہم خاموشی سے جھاڑیوں میں دبک گئے۔ اس کے بعد وہ خود پنجوں کے بل آگے بڑھے اور پتھروں کی منڈیر کے اوپر سے کچھ دیکھنے لگے۔

جو کچھ انھوں نے دیکھا وہ اتنا حیرت انگیز تھا کہ وہ ہمیں بھی بھول گئے۔ ویر تک اسے دیکھتے رہے۔ کئی منٹ بعد انھوں نے ہمیں آنے کا اشارہ کیا۔

ہم سب بھی بڑے اشتیاق مگر احتیاط سے پنجوں کے بل وہاں پہنچے۔ یہ ایک چوڑا اور گہرا غار تھا جس کی تہہ پیالے کی طرح تھی۔ غار اندر سے کئی سو مربع گز کشادہ تھا۔ درمیان میں گدلا پانی تھا جس کا رنگ سبز تھا اور پانی کے چاروں طرف دیوزاد پرندے ٹیروڈیکٹائل بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ ان کا گھونسلا تھا۔ بہت سے بچے پانی کے ارد گرد

کھیل رہے تھے۔ کناروں پر کئی مادائیں بڑے بڑے پیلے رنگ کے بدشکل انڈوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے گننے کی کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ بہرحال بڑوں اور بچوں کی تعداد ملا کر ایک ہزار سے کم نہ ہوگی۔ ہم نے جو آوازیں سنی تھیں وہ اسی غار سے آ رہی تھیں۔ غار سے سخت بدبو بھی اٹھ رہی تھی۔ اگر یہ منظر اتنا حیرت ناک نہ ہوتا تو ہم میں سے کوئی بھی ایک لمحہ یہ بدبو برداشت کرنے کو تیار نہ ہوتا۔

نر پرندے اپنی اپنی جگہ پر بالکل ساکت بیٹھے تھے، جیسے وہ پتھر کے بنے ہوں۔ البتہ ان کی سرخ سرخ خوفناک آنکھیں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

چیلنجر اور سمرلی کو چونکہ پرانے زمانے کے جانوروں کی عادتوں کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اس لیے وہ دن بھر وہاں سے نہ ہٹے۔ غار میں مچھلیوں اور پرندوں کی ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ یہ پرندے گوشت خور ہیں۔ انگلستان میں کیمبرج کے پاس ایک جگہ ان پرندوں کی بہت سی ہڈیاں ملی تھیں۔ اب ثابت ہو گیا کہ وہ ایک ہی جگہ کیوں ملیں۔ دراصل یہ جانور ایک ہی جگہ نشیمن بنا کر رہنے کے عادی تھے۔ یہ مسئلہ صاف ہو جانے پر چیلنجر اور سمرلی دونوں نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو مبارک باد دی۔

لیکن ان دونوں قابل آدمیوں کا یہ ملاپ زیادہ دیر باقی نہ رہا۔ جلد ہی دونوں میں اختلاف ہو گیا اور چیلنجر نے اپنی بات ثابت کرنے

کے لیے اپنا پورا سر غار میں جھکا دیا ——— اور اُن کی یہی حرکت ہمارے لیے مُصیبت بن گئی۔ چیلنجر کے سر کا سایہ دیکھتے ہی ایک نر پرندے نے چیخ ماری اور اپنے بیس فٹ لمبے چمڑے کے پَر پھیلا کر اُوپر اُڑ گیا۔

خطرے کا یہ اِشارہ پا کر مادائیں تو اپنے اپنے بچّوں کو سمیٹ کر بیٹھ گئیں اور نر دُشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایک کر کے اُڑنے لگے۔ دیکھنے میں یہ منظر بڑا اچھا تھا کہ سو کے لگ بھگ دیوزاد پرندے ہوا میں اُڑ رہے تھے اور اُن کے پروں کی آواز ایسی تھی جیسے زور کی آندھی چل رہی ہو۔ لیکن پرندے غالباً اندازہ لگا رہے تھے کہ خطرہ کس حد تک ہے۔ اور جب اُنھوں نے ہم چاروں کو دیکھا تو اُن کی پرواز کے دائرے چھوٹے ہوتے گئے اور وہ نیچے اُڑنے لگے۔

"جلدی بھاگو ——— جنگل کی طرف ... سب ساتھ ہی رہنا۔"

لارڈ جان نے ہدایت کی اور ہم سب دوڑ پڑے۔ لیکن اب وہ پرندے اِتنے قریب آ گئے تھے کہ اُن کے پَر ہمارے سروں کو چھُوتے گزر جاتے۔ ہم اپنی بندوقوں کے کُندے اُن کے پروں کو مارنے لگے مگر کوئی اثر نہ ہُوا اور تھوڑی دیر بعد اُنھوں نے لمبی لمبی گردنیں نِکال کر ہمیں چونچیں مارنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلے سمرلی زخمی ہُوئے۔ اُن کے چہرے سے خون کا فوّارہ اُبل پڑا اور دُوسرے ہی لمحے میری پیٹھ پر دونوں کندھوں کے درمیان ایسی زور کی ٹھونگ پڑی کہ میں لڑکھڑا گیا۔

اُسی وقت چیلنجر گر پڑے اور میں اُنھیں اُٹھانے جھکا تو میرے ایسی زور کی ٹھونگ لگی کہ میں بھی اُن کے اُوپر ہی گر پڑا۔

اچانک لارڈ جان کی ایک نالی بندوق چلنے کی آواز آئی اور ایک پرندہ جس کا ایک بازو ٹوٹ گیا تھا زمین پر گر کر پھڑپھڑانے لگا۔ یہ اچھا ہی ہُوا۔ اِس لیے کہ اُس کے گرتے ہی باقی پرندے ڈر کر اُوپر چلے گئے اور وہیں چکر لگاتے رہے۔

"خُدا کے لیے بھاگو ———"

لارڈ جان نے چیخ کر کہا اور ہم سب گرتے پڑتے جنگل میں گھُس گئے۔ غنیمت تھا کہ گھنے درختوں کی وجہ سے پرندے ہم تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ آخر کسی نہ کسی طرح ہم اپنے قلعے کی طرف آ ہی گئے۔ سمرلی کی پیشانی اور میری پیٹھ میں گردن کے پاس زخم آئے تھے۔ لارڈ جان کا کوٹ کندھے پر سے پھٹ گیا تھا اور پرندے کی چونچ نے جلد پر ہلکا سا چرکا بھی لگا دیا تھا۔ لارڈ جان نے کہا:

"بھئی معاف کرنا۔ مجھے گولی چلانی پڑی۔ اِس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔"

"اگر تم گولی نہ چلاتے تو شاید ہم زندہ بھی نہ بچتے۔" سمرلی نے جواب دیا۔

جب ہم فورٹ چیلنجر پہنچے تو دروازہ جیسا چھوڑ گئے تھے ویسا ہی بند تھا اور کانٹوں کی جھاڑیاں کاٹ کاٹ کر ہم نے جو دیواریں بنائی

تھیں اُنھیں بھی کسی نے نہیں چھوا تھا اس کے باوجود ہمارا سارا سامان تلپٹ تھا اور سب چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

ہماری غیر موجودگی میں جو کوئی بھی آیا تھا اُس کی طاقت کا بہرحال ہمیں اندازہ ہوگیا۔ اِس لیے کہ گوشت کا ایک ٹین توڑ مروڑ کر پھینک دیا گیا تھا اور کارتوسوں کی ایک پیٹی کے تو پرخچے اُڑا دیے گئے تھے۔

سمرلی اور چیلنجر تو ان دیوزاد پرندوں کی بناوٹ اور عادات وغیرہ کے بارے میں بحث میں مصروف ہوگئے۔ میں اور لارڈ جان الگ لیٹ کر پائپ پینے لگے۔ لارڈ جان نے کہا۔

"میلون، وہ غار آتش فشاں پہاڑ کا دہانہ تھا"

"ہاں"

اس کے اندر پانی کا جو گڑھا تھا اُس کے کنارے مٹی کا رنگ کیسا تھا۔

"شاید ہلکا نیلا تھا" میں نے جواب دیا۔

"آتش فشاں کے دہانے میں نیلی مٹی ــــ آتش فشاں کے دہانے میں نیلی مٹی ــــ"

لارڈ جان بڑبڑاتے رہے اور مجھے نیند آگئی۔

ان پرندوں کے لعاب میں کوئی زہر تھا۔ اِس لیے کہ دوسرے دن میرے اور سمرلی کے زخموں میں شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور بخار

چڑھا ہوا تھا۔ چیلنجر کے گھٹنے پر چوٹ لگی تھی اور اب وہ سوج گیا تھا۔ لہٰذا ہم اُس روز باہر نہیں گئے۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے سارا دن یہی احساس رہا کہ کوئی چھپ چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہے۔ یہ احساس اِتنا شدید تھا کہ میں نے چیلنجر سے ذکر کیا لیکن اُنھوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ بخار میں ایسا ہی لگتا ہے۔

لیکن آپ یقین کیجیے کہ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا میرا یہ احساس بڑھتا گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ جنگل کی روح کُروپوری ہے جس سے ایمزن کے لوگوں کا دم نکلتا ہے۔

اور پھر رات کو ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے ہمیں اور بھی ڈرا دیا۔ وہ تو خدا لارڈ جان کا بھلا کرے کہ اُنھوں نے فورٹ چیلنجر کی حفاظت کا بہت اچھا انتظام کیا تھا۔

ہم نے سونے سے پہلے الاؤ جلا لیا تھا اور سو رہے تھے کہ اچانک عجیب و غریب چیخوں کی آواز سے ہماری آنکھ کھل گئی۔ آگ بجھنے کے قریب تھی۔ یہ آوازیں ہمارے کیمپ سے صرف چند سو گز کے فاصلے سے آرہی تھیں اور ریل کے انجن کی سیٹی کی طرح تیز تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ چیخنے والا جانور بڑی شدید تکلیف میں مبتلا ہے۔ میرے تو ٹھنڈے پسینے چھوٹ گئے اور میرا خیال ہے کہ میرے ساتھیوں کی بھی یہی حالت تھی۔

اور پھر ان چیخوں کے ساتھ کسی اور جانور کے غرّانے کی آواز

آئی۔ پہلے جانور نے ایک خوفناک چیخ ماری جو اچانک ختم ہوگئی۔ جیسے گلے میں گھٹ کر رہ گئی ہو اور پھر بالکل خاموشی چھاگئی۔ ہم اس کے بعد بھی کئی منٹ گم سُم بیٹھے رہے۔ بڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔

"یہ کیا تھا؟"

"صبح چل کر دیکھیں گے۔" لارڈ جان نے جواب دیا۔ اس پر چیلنجر نے کہا "یہ سارا ہنگامہ یہ تھا کہ ایک جانور نے دوسرے کا شکار کیا ہے۔ جنگلوں میں ہمیشہ یہ ہوتا آیا ہے اور آج بھی ہوتا ہے۔"

ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ سمرلی نے ہونٹوں پر ایک انگلی رکھ کر ہمیں خاموش رہنے کو کہا۔ ہم نے غور سے سُنا تو کوئی جانور ہمارے قلعے کا چکر لگا رہا تھا۔ اُس کے قدموں کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہت وزنی ہے اور اُس کے پاؤں گدی دار ہیں۔ پورا چکر لگا کر وہ دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس کی تیز تیز سانسوں کی آواز صاف سُنائی دے رہی تھی جیسے دھونکنی چل رہی ہو۔ اُس کے اور ہمارے درمیان کانٹوں دار جھاڑیوں کی ایک دیوار تھی جسے وہ آسانی سے روند سکتا تھا۔

ہم نے بندوقیں سنبھال لیں اور جھاڑیوں میں سے جھانک کر دیکھا تو اندھیرے میں جانور کا بڑا سا ہیولا نظر آیا۔ دو بڑی بڑی سبز رنگ کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اچانک جھاڑیوں میں کچھ آواز ہوئی جیسے وہ ایک پیر سے انھیں ٹٹول رہا ہو۔

"یہ شاید کود کر اندر آ جائے گا۔" میں نے کہا اور نشانہ لینے لگا مگر لارڈ جان نے یہ کہہ کر مجھے روک دیا۔

"رات کے سناٹے میں گولی کی آواز بہت دور تک سُنائی دے گی۔"

"اور اگر یہ کود کر اندر آ گیا تو؟" سمرلی نے گھبرا کر کہا جس پر لارڈ جان نے ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود الاؤ میں سے ایک سُلگتی ہوئی بڑی سی لکڑی اٹھالی۔ اِس کے بعد اچانک دروازہ کھول کر انھوں نے جانور کے مُنہ پر وار کیا۔ اُس کا مُنہ مینڈک جیسا تھا اور کھال پر تیندوے کی طرح کے نشان تھے۔ سُلگتی ہوئی لکڑی مُنہ پر پڑتے ہی وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ جھاڑیوں کے روندے جانے کی آواز دیر تک آتی رہی۔ لارڈ جان نے ہنستے ہوئے وہ لکڑی واپس الاؤ میں ڈال دی۔ ہم سب اُن کی اِس جرأت پر عش عش کر اٹھے۔ واقعی وہ سچے شکاری تھے۔

اِدھر پھر چیلنجر اور سمرلی میں زوردار بحث شروع ہوگئی کہ یہ جانور حیوانوں کی کس نسل، کس خاندان اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا تھا قریب تھا کہ یہ بات بڑھ جاتی کہ لارڈ جان نے یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کرا دیا۔

"آئندہ سب ایک ساتھ نہیں سوئیں گے۔ باری باری ایک ایک آدمی دو دو گھنٹے پہرا دیا کرے گا۔"

"صبح کو ہم یہ دیکھنے کے لیے نکلے کہ رات لڑائی کہاں ہوئی تھی۔

اُس کُھلے میدان میں جہاں ہم نے ڈینو سار دیکھے تھے۔ بہت سارا خون پڑا ہُوا تھا جس سے کیچڑ سی ہو گئی تھی۔ گوشت کے لوتھڑے بھی بکھرے ہُوئے تھے۔ پہلے تو ہم سمجھے کہ شاید کئی جانور مارے گئے ہیں لیکن غور سے دیکھنے سے پتا چلا کہ کوئی بہت بڑا جانور تھا جس کو کسی اُس سے بھی زیادہ طاقت ور اور خونخوار جانور نے چیر پھاڑ کر رکھ دیا تھا۔

سمرلی اور چیلنجر میں پھر بحث چھڑ گئی کہ یہ کس قسم کے جانور ہو سکتے ہیں۔ گوشت کے لوتھڑوں، ہڈیوں، زخموں کے نشانات وغیرہ کی بُنیاد پر وہ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کر رہے تھے اور پُرانے زمانے کے عجیب و غریب قسم کے جانوروں کے نام لے رہے تھے جن میں سے بہت سے نام میرے لیے بالکل نئے تھے۔ آخر لارڈ جان نے کہا۔

"شکاری جانور دوبارہ پیٹ بھرنے کے لیے شکار کی جگہ واپس آتا ہے۔ اِس لیے یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔"

یہ کہتے ہُوئے لارڈ جان کی نظر گوشت کے ایک لوتھڑے پر پڑی جس کی کھال پر راکھ کے رنگ کا گول حلقہ سا بنا تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا تھا۔ سمرلی نے کہا۔

"پرسوں ہم نے یہاں جو جانور دیکھے تھے، میرا خیال ہے اُن کی کھال پر بھی ایسے ہی نشان تھے۔"

چیلنجر نے کہا "یہاں جلے ہوئے پتھر کی چٹانیں ہوں گی جن سے یہ نشان لگ گیا ہوگا۔"

یُوں یہ بات ختم ہو گئی۔ ہم دلدل اور پرندوں کے غار سے بچتے ہُوئے کچھ دُور تک گئے۔ یہاں درختوں کی چھاؤں میں اتنا جھاڑ جھنکاڑ تھا کہ قدم اُٹھانا مُشکل تھا۔ ان جھاڑیوں میں عجیب و غریب قسم کے پھول بھی کھلے تھے۔ چیلنجر اور سمرلی نے بتایا کہ یہ نباتات کی ابتدائی شکل ہے۔ دُنیا میں اِس قسم کے پودے ختم ہو چکے ہیں۔

درختوں میں طرح طرح کے پھل بھی لگے ہُوئے تھے۔ کچھ تو جانے پہچانے تھے لیکن باقی نئے تھے۔ بعض تو اتنے خُوب صُورت تھے کہ بے اختیار کھا لینے کو جی چاہتا تھا لیکن اِس ڈر سے جی مار کر رہ گئے کہ کہیں زہریلے نہ ہوں۔ بعد میں کچھ پھل چڑیوں کو کھاتے دیکھ کر ہم نے بھی کھائے۔ اُن کا مزہ میں زندگی بھر نہ بھول سکوں گا۔

راستے میں طرح طرح کے جانوروں کے پیروں کے نشان ملے جن پر بحث ہوتی رہی۔ لارڈ جان نے، جن کے پاس دُوربین تھی، بتایا تھا کہ دُور درختوں کے ایک جُھنڈ تلے، بہت سے ڈینو سار آرام کر رہے ہیں۔ ہم نے باری باری دیکھا۔ اِن کے جسموں پر بھی راکھ کے رنگ کے گول نشان تھے لیکن وہ جسم کے دُوسرے حصّے پر تھے۔ کافی غور کرنے کے بعد بھی ہم اس کی وجہ معلوم نہ کر سکے۔

پھر ہم نے بہت سے چھوٹے جانور بھی دیکھے، مثلاً سیہہ، مورخور،

چھوٹی نسل کے جنگلی سور وغیرہ، درختوں کی آڑ میں ہم نے تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک جانور کی جھلک بھی دیکھی۔ لارڈ جان کے خیال میں وہ ہرن کی قسم کا کوئی جانور تھا لیکن اس کا قد ہمارے ہاں کے ہرنوں سے دو گنا بڑا تھا۔

جب سے ہمارے قلعے پر چھاپا مارا گیا تھا، ہم بہت ڈر گئے تھے لیکن وہاں واپس پہنچنے پر سب کچھ ٹھیک ٹھاک ملا۔ کھانا کھا کر اور کچھ آرام کرنے کے بعد ہم نے غور کرنا شروع کیا کہ پورے علاقے کا جائزہ کس طرح لیا جائے۔

لارڈ جان کچھ سوچ رہے تھے۔ کہنے لگے۔ "تم لوگ اِس علاقے میں اندر اندر گھسنے کی فکر کر رہے ہو۔ یہ بھی تو سوچو کہ یہاں سے باہر نکلنے کی کیا صورت ہوگی؟"

اِس پر چیلنجر نے سنجیدگی سے کہا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سائنسی چھان بین کا شوق رکھنے والا کوئی آدمی ایسی گھٹیا بات کیونکر کہہ سکتا ہے۔ تمھارے خیال میں ہم تحقیق کے اِس لاجواب موقع سے فائدہ اُٹھائے بغیر واپس چلے جائیں؟"

سمرلی شاید لارڈ جان کے حامی تھے۔ کہنے لگے۔ "میں لندن میں جن طالب علموں کو پڑھاتا ہوں، اُن کا بڑا حرج ہو رہا ہوگا۔ مسٹر چیلنجر پر تو کوئی ایسی ذمہ داری نہیں ہے، اِس لیے انھیں چھان بین کی سوجھ رہی ہے۔"

"اعلیٰ ذہن رکھنے والے لوگ پڑھانے جیسا گھٹیا کام نہیں کرتے۔" چیلنجر نے جواب دیا۔

"سچ پوچھیے تو اس علاقے کی پوری سیر کیے بغیر خود میرا دل بھی واپس ہونے کو نہ چاہتا تھا۔ اخبار میں ادھوری رپورٹ شائع کرنے کا کیا فائدہ؟ پھر میں تو یہ کارنامہ گلیڈی کے لیے انجام دے رہا تھا۔ اِس لیے اسے ادھورا نہ چھوڑ سکتا تھا۔ ادھر سمرلی اس پر اڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا۔

"اس جماعت کو مسٹر چیلنجر کے دعوے کی تصدیق کا کام سونپا گیا تھا اب تک ہم نے جو کچھ دیکھا ہے اُس کی بنا پر ہم اس کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اب یہاں ٹھہرنے سے کیا حاصل۔ یہاں یہ خطرہ بھی ہے کہ ہم کسی درندے کا شکار بن جائیں۔ اور جو معلومات سائنس کے لیے لے جا سکتے ہیں اُن سے بھی رہ جائیں۔"

لارڈ جان نے سمرلی کی بات کی پُرزور تائید کرنے کے بعد کہا "اِس سطح مرتفع تک پہنچنے کے لیے ہم پروفیسر چیلنجر کی ذہانت کے شکرگزار ہیں۔ اُمید ہے کہ اب وہ یہاں سے نکلنے کی ترکیب سوچ کر مزید شکریے کا موقع دیں گے۔"

چیلنجر نے کہا۔ "یقیناً ہمیں واپسی کے سوال پر غور کرنا ہے اور اِس سلسلے میں میرا اعلیٰ ذہن دوستوں کی خدمت کے لیے حاضر ہے لیکن جب تک کوئی راہ نکلے، اِس علاقے کو ایک نظر دیکھ لینے میں

کیا مقابلہ ہے۔"

بات ٹھیک ہی تھی۔ اس سے کون انکار کر سکتا تھا۔ اب مشکل یہ تھی کہ ہمیں اس علاقے کا جغرافیہ معلوم نہیں تھا۔ گھنے جنگلوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بچتے ہوئے علاقے کا دورہ کس طرح کیا جاتا۔ آخر میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی۔ ہمارے قلعے میں ایک بہت اونچا اور گھنا درخت تھا۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس پر چڑھ کر دوربین سے اردگرد کا جائزہ لیا جائے۔

یہاں میں ایک بات آپ کو بتا دوں۔ بچپن میں درختوں پر چڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ میرے ساتھی پہاڑوں پر چڑھنے کا بھلے ہی مجھ سے زیادہ تجربہ رکھتے ہوں لیکن پیڑ پر چڑھنے میں وہ میرا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

میری تجویز سن کر سب خوش ہوئے۔ لارڈ جان نے میری پیٹھ تھپکی اور کہا: "ابھی سورج ڈوبنے میں ایک گھنٹا ہے۔ کاپی اور پنسل لے کر اوپر چڑھ جاؤ اور علاقے کا نقشہ بنا ڈالو۔ شاباش میرے شیر۔ ذرا جلدی۔"

درخت کا پھیلاؤ اتنا اگر ذرا پتلا ہوتا تو میں آسانی سے اس سیدھے درخت پر بھی چڑھ جاتا۔ لیکن وہ اتنا موٹا تھا کہ میری گرفت میں نہیں آتا تھا۔ آخر ہم نے کارتوسوں کی پیٹیاں درخت کے نیچے ایک دوسرے پر جمائیں۔ ان پر چیلنجر چڑھ گئے۔ میں نیچے کھڑا رہا۔ اچانک

چیلنجر نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے میرے بازو پکڑ کر اٹھایا اور ایک ہی جھونک میں اتنے زور سے اچھالا کہ میں درخت کے پہلے گدے تک پہنچ گیا۔ جلدی سے میں نے دونوں ہاتھوں سے گدا تھام لیا اور بدن جھلا کر اوپر پہنچ گیا۔ اس سے آگے تو شاخیں ہی شاخیں تھیں۔

میں بڑی تیزی سے اوپر چڑھتا چلا گیا۔ موٹی موٹی بیلیں درخت سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ان سے بھی بڑا سہارا مل رہا تھا۔ نیچے سے چیلنجر کی آواز اب بہت مدھم سنائی دے رہی تھی۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ گھنے پتوں کی وجہ سے کچھ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اوپر دیکھا تو درخت ابھی بہت اونچا تھا۔ میں پھر چڑھنے لگا اور پھر ایک بار جب میں نے گھنے پتوں والی ایک پتلی شاخ اپنے سامنے سے ہٹائی تو بس یہ سمجھیے کہ مارے ڈر کے گرتے گرتے بچا۔ مجھے صرف دو فٹ کے فاصلے پر ایک چہرہ دکھائی دیا تھا۔ یہ ایک انسانی چہرہ تھا۔ کسی بندر کا چہرہ انسان سے اتنا ملتا جلتا نہیں ہو سکتا تھا۔ سفید رنگ کے لمبوترے چہرے پر کثرت سے مہاسے تھے۔ ناک چپٹی تھی اور جبڑا ذرا آگے کو نکلا ہوا تھا۔ ٹھوڑی پر بے ترتیب سی ڈاڑھی بھی تھی۔ گھنی بھووں کے نیچے دو ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑبڑایا، دانت پیسے اور پھر ایک بیل پکڑ کر کود گیا۔ میں نے اس کے جسم کی ایک جھلک دیکھی۔

لال لال جسم تھا اور بالکل ننگا۔

اس کے بھاگنے سے کئی شاخیں ٹوٹیں جن کی آواز نیچے بھی گئی ہو گی۔ اس لیے لارڈ جان نے نیچے سے چلا کر پوچھا: "کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟"

"آپ نے اُسے دیکھا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ ابھی تک میرے جسم میں تھرتھری تھی اور دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

"ہمیں ایسا لگا جیسے تمہارا پیر پھسل گیا ہو۔" لارڈ جان کی آواز آئی۔

میرا تو جی چاہتا تھا کہ فوراً نیچے اُتر آؤں اور اپنے ساتھیوں کو بتاؤں کہ میں نے کیا دیکھا۔ لیکن پھر سوچا کہ جس کام کے لیے چڑھا ہوں اُسے بھی کرتا ہی چلوں۔ میں نے اپنے اوسان ٹھیک کیے۔ اور پھر اوپر چڑھنے لگا۔ جلد ہی سب سے اونچی ٹہنی پر پہنچ گیا جو میرے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ یہاں بڑی تیز ہوا تھی جس سے اندازہ ہوا کہ یہ پیڑ آس پاس کے تمام درختوں سے اونچا ہے۔ میں نے اپنے سامنے کی پتلی پتلی شاخیں توڑ ڈالیں جن کے پتوں نے مجھے ڈھک رکھا تھا۔ اس کے بعد سامنے نظر ڈالی۔ اب پورا علاقہ مجھے نظر آ رہا تھا۔ یہ بیضوی شکل کا تھا۔ سامنے کوئی تیس میل اور دائیں سے بائیں بیس میل لمبا چوڑا۔ کنارے اونچے تھے اور درمیان میں نشیب ہوتا چلا گیا تھا۔ بیچوں بیچ جھیل تھی جس کا رقبہ دس مربع میل سے کم نہ ہو گا۔ جھیل کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا اور ایک طرف

نرکل اُگے ہوئے تھے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں کناروں کی ریت سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ ریت میں کالی کالی، لمبی لمبی کچھ چیزیں سی رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مگرمچھوں سے بڑی اور کشتیوں سے چھوٹی تھیں۔ دوربین سے دیکھنے سے پتا چلا کہ یہ جانور ہیں مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ یہ کس قسم کے جانور ہیں۔

ہمارے ٹھکانے سے یہ جھیل کوئی چھ میل دور تھی۔ ڈینو سار جہاں دیکھے گئے تھے وہ جگہ اور دیو نما پرندوں کا غار اس سے پہلے تھا۔ جھیل سے آگے کا علاقہ بالکل دوسری قسم کا تھا۔ آخری کنارے میں راکھ کے رنگ کے جلے ہوئے پتھروں کی کوئی سو فٹ بلند دیوار نما چٹانیں تھیں۔ ان سے اندر کی طرف ڈھال تھا۔ دوربین سے دیکھنے پر ان چٹانوں میں کالے کالے سوراخ سے نظر آئے جو میرے خیال میں غاروں کے منہ تھے۔ ایک غار کے آگے کوئی سفید سفید سی چیز حرکت کر رہی تھی لیکن میری سمجھ میں نہ آ سکا کہ وہ کیا چیز تھی۔

جو کچھ مجھے نظر آیا، میں اس کا نقشہ بناتا گیا یہاں تک کہ اتنا اندھیرا ہو گیا کہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ چنانچہ میں اُترنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ ایک ہی جست میں نیچے پہنچ جاؤں۔ جب نیچے آیا تو سب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں نے نقشہ دینے سے پہلے انہیں بتایا کہ درخت پر مجھے ایک بن مانس ملا تھا۔

"میں یہ کہتا تھا کہ ہمیں کوئی چھپ چھپ کر دیکھتا ہے۔ وہ یہی بن مانس تھا۔" میں نے کہا۔ اس پر چیلنجر اور سمرلی نے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"کیا اُس کے دُم تھی؟"

"نہیں۔"

"پیروں کی چار انگلیاں ایک طرف اور انگوٹھا دُوسری طرف تھا یا سب ساتھ ہی ساتھ تھے؟"

"یہ میں نہیں دیکھ سکا۔"

چیلنجر نے کہنا شروع کیا۔ جنوبی امریکہ میں بندروں کی چھتیس قسمیں پائی جاتی ہیں لیکن بے دُم کا بندر یہاں نہیں ہوتا۔ البتہ اس سطح مرتفع پر وہ بھی موجود ہے اور جو تفصیل تم نے بتائی اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ انسان سے بہت قریب ہے۔ یعنی بندر کے انسان بننے کے سلسلے کی آخری کڑی ہے۔"

پھر پروفیسر چیلنجر کچھ سوچ کر بولے۔ گورے رنگ کا بن مانس آج تک نہیں دیکھا گیا۔ سائنس دان جسے گم شدہ کڑی کہتے ہیں اس کی اصلیت ہمیں معلوم کرنا ہی پڑے گی۔"

"ہوش کی دوا کرو۔" سمرلی نے جل کر کہا۔ "یہ بے چارہ اُوپر جا کر نقشہ بنا لایا ہے اسے دیکھو اور واپسی کی سوچو۔"

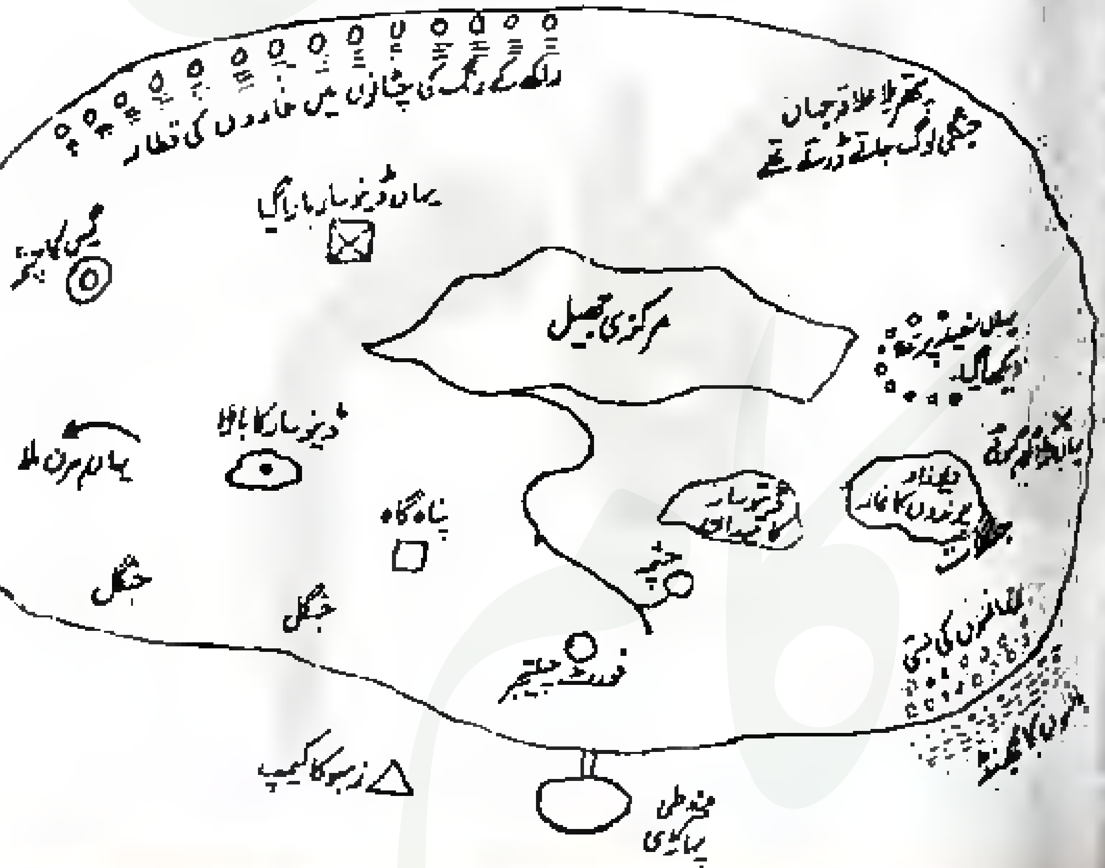
"یہ تہذیب کا گہوارہ ہے۔" چیلنجر نے بڑی سنجیدگی سے کہا جس پر

سمرلی نے جواب دیا۔

بھاڑ میں گئی تمہاری تہذیب اور اس کا گہوارہ۔ جو کچھ معلوم ہو چکا ہے اُسے لکھ ڈالو اور باقی تحقیقات دُوسروں کے لیے چھوڑ دو۔"

چیلنجر بولے۔ مجھے اس سے تو اتفاق ہے کہ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے اسے جلد سے جلد مہذب دُنیا تک پہنچ جانا چاہیے۔ لیکن یہاں سے نکلنے کے بارے میں ابھی میں کوئی طریقہ نہیں سوچ سکا ہوں۔ بہرحال اطمینان رکھو کہ آج تک میں نے ایسا کوئی مسئلہ نہیں دیکھا جسے سلجھانے میں میرا اعلیٰ ذہن ناکام رہا ہو ـــــ کل میں اس مسئلے پر ضرور توجہ دُوں گا۔"

بات طے ہو گئی۔ اس رات موم بتی کی روشنی میں میں نے میپل وہائیٹ لینڈ کا پہلا نقشہ بنایا جو کچھ اس طرح کا تھا۔



چیلنجر نے نقشے کو غور سے دیکھ کر جھیل پر اپنی پنسل گھماتے ہوئے کہا: "اس جھیل کا کیا نام رکھا جائے؟"

"تمھارے نام پر رکھ دیں؟" سمرلی نے طنز کیا جس کی کاٹ چیلنجر نے اِس طرح کی۔ "وہ بڑے ہی غیر اہم لوگ ہوتے ہیں جو کسی پہاڑ، دریا یا جھیل کا نام اپنے نام پر رکھتے ہیں۔ میرے پاس شہرت کے دوسرے ذریعے موجود ہیں۔"

آخر اُن لوگوں نے طے کیا کہ چونکہ میلون نے اُسے سب سے پہلے دیکھا ہے اِس لیے اِسے جھیل میلون کہا جائے۔ یہ سُن کر میں نے تجویز پیش کی کہ "اِسے میرے نام سے منسوب کرنے کے بجائے جھیل گلیڈی کہیے۔"

اور اس جھیل کا نام جھیل گلیڈی طے ہو گیا۔

کیمپ پر حملہ

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میں اپنے ساتھیوں میں سب سے کم عمر اور ناتجربہ کار تھا۔ مگر جب میں نے ایک آدھ ایسا کارنامہ انجام دیا جس پر میرے ساتھیوں نے مجھے مُبارک باد دی تو پھر مجھے بھی دُور دُور کی سوجھنے لگی اور مزید کارنامے انجام دینے کے شوق میں اگلی رات کو میں مرتے مرتے بچا۔

ہُوا یہ کہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہرا دینے کی باری سمرلی کی تھی۔ وہ الاؤ کے پاس گھٹنوں پر بندوق رکھے بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔ لارڈ جان سو رہے تھے اور چیلنجر کے خراٹے جنگل میں گونجتے محسوس ہو رہے تھے۔ چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ہوا میں خُنکی تھی۔ میں لیٹا ہُوا چاند کو تک رہا تھا کہ اچانک خیال آیا کہ کیوں نہ چپکے سے جھیل تک ہو آؤں۔ صُبح کو اپنے ساتھیوں کو اس کے بارے میں بتاؤں گا تو انھیں بہت حیرانی ہو گی۔

یہ سوچ کر میں چپکے سے اٹھا۔ رائفل سنبھالی، دونوں جیبوں میں

کارتوس بھرے اور باہر نکل آیا۔

میں آگے ہی بڑھتا چلا گیا۔ درخت اتنے گھنے تھے کہ چاند نظر نہ آتا تھا۔ اندھیرے میں جگہ جگہ سیاہ دھبے نظر آتے تو میں سمجھتا کہ یہ کسی جانور کا بھٹ ہوگا۔ میں آہٹ کیے بغیر اُس کے سامنے سے گزر جاتا۔ چلتے چلتے خیال آیا کہ احتیاطاً رائفل بھر لینا چاہیے یہ سوچ کر میں نے ایک کارتوس نکالا اور رائفل میں بھرنے لگا۔ تب پتا چلا کہ میں غلطی سے لارڈ جان کی ایک نالی بندوق اُٹھا لایا ہوں اور میرے پاس کارتوس رائفل کے ہیں۔

اب بھی میں لوٹ جاتا تو خیریت ہوتی مگر وہاں تو کوئی کارنامہ انجام دینے کا بھوت سر پہ سوار تھا لہٰذا میں بڑھتا ہی رہا اور ڈر کا میدان ڈرتے ڈرتے پار کر لیا۔ خوش قسمتی سے وہاں کوئی جانور نہ تھا۔ میں درخت پر سے دیکھ ہی چکا تھا کہ چشمہ بل کھاتا ہوا جھیل تک پہنچتا ہے لہٰذا میں چشمے کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ جانور چشمے پر پانی پینے آتے ہوں گے۔

کچھ دور اور آگے چل کر جنگل ختم ہو گیا۔ اکا دکا پیڑ اور جھاڑیاں رہ گئیں۔ میں دبے پاؤں ٹیروڈیکٹائلوں کے غار کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک دیوزاد پرندہ شاید میری آہٹ پا کر اُڑا اور بیس فٹ چوڑے پر پھیلائے آسمان کی طرف چلا گیا۔ جب وہ چاند کے سامنے سے گزرا تو اُس کے پروں میں سے روشنی چھن

کر دکھائی دینے لگی اور وہ بالکل ایک ڈھانچا معلوم ہونے لگا۔

آگے بڑھنے پر مجھے ایک خاص قسم کی آواز سنائی دینے لگی۔ میں نے رک کر اُسے غور سے سنا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ آواز صاف ہوتی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بہت بڑی کیتلی میں پانی اُبل رہا ہو۔ آخر کار میں اُس جگہ پہنچ گیا۔ یہ گرم پانی کا ایک چشمہ تھا جس میں سے گیس کے بُلبلے پھوٹ رہے تھے۔ چشمہ چھوٹا سا تھا مگر اُس میں سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور آس پاس کی زمین اتنی گرم تھی کہ میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔

اب جنگل پھر شروع ہو گیا مگر وہ اتنا گھنا نہ تھا۔ کبھی کبھی دور سے کسی جانور کے بھاگنے اور شاخوں کے ٹوٹنے کی آواز آتی تو میں سہم جاتا مگر اب میں اتنا آگے بڑھ آیا تھا کہ لوٹ کر جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ آخر کوئی ایک بجے میں نے درختوں کے اُس پار جھیل کے پانی کی جھلک دیکھی جو چاندنی میں چمک رہا تھا اور صرف دس منٹ بعد میں اس کے کنارے نرکلوں کے جھنڈ میں کھڑا تھا۔

کچھ چلنے کی وجہ سے اور کچھ خوف سے میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے چلّو میں لے کر پانی پیا۔ بڑا ٹھنڈا اور میٹھا پانی تھا۔ قریب ہی ایک صاف سی جگہ تھی جدھر سے کچھ پگڈنڈیاں سی آ کر مل رہی تھیں۔ اِس سے مجھے اندازہ ہوا کہ جانور یہاں پانی پینے آتے ہوں گے۔

پانی کے قریب ہی سیاہ پتھر کی ایک چٹان تھی۔ میں اس پر چڑھ کر ٹانگیں پھیلا کے لیٹ گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ درخت سے میں نے دیکھا تھا کہ علاقے کے آخری کنارے پر راکھ کے رنگ کی جو اُونچی چٹانوں کی دیوار تھی اُس میں بہت سے کالے کالے دھبے نظر آرہے تھے، جیسے غار ہوں۔ لیکن اب اس طرف دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اس لیے کہ اب وہ سیاہ دھبے روشنی کے دھبوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بحری جہاز کی کھڑکیوں سے روشنی آرہی ہو۔

ظاہر ہے غاروں میں اس روشنی کا مطلب تھا آگ۔ اور آگ کا مطلب تھا آدمی ـــ گویا یہاں اِنسان بھی بستے ہیں۔ اُف میرے خُدا۔ یہ کتنی عظیم دریافت تھی اور اس کا سہرا میرے سر تھا۔ ان غاروں کا فاصلہ مجھ سے کوئی دس میل ہوگا۔ اس کے باوجود یہ جھلملاتی روشنیاں صاف نظر آرہی تھیں۔

جھیل گلیڈی یوں لگ رہی تھی جیسے چاندی کی بڑی سی چادر بچھی ہو۔ یہ غالباً زیادہ گہری نہیں تھی اس لیے کہ اس میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے ریتیلے ٹاپو اُبھرے ہوئے تھے۔ پانی میں کافی ہلچل تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ مچھلیاں وغیرہ بہت ہیں۔ کبھی کبھی چاندی کے رنگ کی کوئی مچھلی اُچھلتی اور ہلکے سے چھپاکے کے ساتھ پھر پانی میں گر پڑتی۔ کبھی کبھی کسی بہت بڑے آبی جانور کی

پیٹھ پانی سے اُبھرتی اور پھر غائب ہو جاتی۔ ایک بار میں نے ہنس کی قسم کا ایک بڑا سا پرندہ دیکھا جس کی گردن بہت لمبی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے غوطہ لگایا اور پھر نظر نہ آیا۔

میں نے چٹان کے نیچے نظر ڈالی تو کئی جانور نظر آئے جو پانی پینے آئے تھے۔ وہ جانور ایسے تھے جن کے بدن پر سخت ہڈیوں کے چھلکے سے منڈھے تھے۔ ایک بہت بڑا بارہ سنگا تھا جس کے ساتھ اس کی مادہ اور دو بچے تھے۔ وہ بڑی شان سے آیا اور پانی پی کر واپس چلا گیا۔

اچانک کچھ آہٹ ہوئی اور باقی سارے جانور ڈر کر بھاگ گئے۔ اور اب جو جانور آیا وہ نہایت عجیب و غریب تھا۔ اس کی پیٹھ کمان کی طرح تھی جس میں نکونی تھکلیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُونٹ کی سی لمبی گردن، چڑیا کی شکل کا سر اور مگرمچھ جیسی موٹی سی دُم۔ میں سوچنے لگا کہ یہ جانور جانا پہچانا سا کیوں لگ رہا ہے۔ آخر دماغ پر زور دینے سے یاد آیا کہ پروفیسر چیلنجر کے ہاں میپل وہائٹ کی ڈائری کی کتاب میں اسی جانور کا خاکہ دیکھا تھا۔

جانور اتنا وزنی تھا کہ اس کے قدموں کے دھماکوں سے زمین لرز جاتی تھی اور جب وہ پانی پینے لگا تو پانی پینے کی آواز بڑی دُور تک گونجتی محسوس ہوئی۔ کوئی پانچ منٹ تک وہ پانی پیتا رہا۔ اُس وقت میں اگر چاہتا تو ذرا سا جھک کر اُس کی پیٹھ کو چھو سکتا تھا۔

اس کے بعد وہ اُسی طرح قدموں سے زمین دہلاتا چلا گیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دو بج چکے تھے۔ ایک رات میں میں نے جو کچھ دیکھ لیا تھا وہ آج تک دُنیا میں کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ میں نے سوچا کہ اب واپس چلنا چاہیے۔

میں خوش خوش کیمپ کی طرف چل دیا۔ راستے میں سوچتا جا رہا تھا کہ میری ایک ایک بات پر چیلینجر اُچھل اُچھل پڑے گا۔ تقریباً آدھا راستہ طے ہُوا ہوگا کہ اچانک میں نے اپنے پیچھے کچھ عجیب قسم کی آواز سُنی۔ یہ غُرّانے سے ملتی جلتی بڑی ڈراؤنی آواز تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ بہرحال میں نے قدم تیز کر دیے اور تقریباً دوڑنے لگا۔

کوئی آدھ میل چلنے کے بعد پھر وہی آواز سُنائی دی۔ مگر اب یہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ صاف اور زور کی تھی۔ یہ سوچتے ہی میرا خون خشک ہو گیا کہ کوئی جانور میرے پیچھے لگ گیا ہے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور گھٹنے کانپنے لگے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو اِس مرتبہ بھی کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک وہی آواز پھر آئی اور اب کے اور زیادہ قریب سے آئی۔ اب تو کوئی شُبہ ہی نہیں تھا کہ کوئی جانور میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میرا سارا جسم سُن سا ہو گیا تھا۔ دُوسرے ہی لمحے میں نے ایک خوفناک جانور دیکھا جو پچھلی ٹانگوں کے بل اُچھلتا چلا آ رہا تھا۔ اس کا قد ہاتھی سے بڑا تھا۔ پہلے تو

میں سمجھا کہ یہ وہی سبزی خور اور بے ضرر ڈینوسار ہوگا لیکن جب اس کے سر پر میری نظر پڑی تو معلوم ہُوا کہ اس کی صُورت ہرن جیسی نہیں بلکہ مینڈک کی طرح ہے۔ یُوں سمجھیے کہ ہاتھی کے قد کا ایک خوفناک مینڈک اُچھلتا چلا آ رہا تھا۔ یہ ویسا ہی جانور تھا جو ہمارے کیمپ کے پاس آیا تھا اور لارڈ جان نے اُس کے مُنہ پر سُلگتی ہوئی لکڑی مار کر اُسے بھگایا تھا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی گوشت خور ڈینوسار ہے۔ تھوڑی تھوڑی دُور پھُدکنے کے بعد وہ اپنا سر زمین کے قریب لا کر زور سے سُونگھتا اور پھر پھُدکنے لگتا۔ ظالم میری بُو کا پیچھا کر رہا تھا۔ مجھے اب افسوس ہُوا کہ میں غلط بندوق کیوں لے آیا۔ وہاں کوئی بڑا درخت بھی نہ تھا جس پر میں چڑھ جاتا۔ ویسے بھی وہ اپنی ایک ہی ٹکر سے درخت کو گرا سکتا تھا۔ اب بھاگنے کے سوا چارہ نہ تھا۔

میں نے حواس دُرست کیے اور بھاگ نکلا۔ مگر اُونچی نیچی زمین اور جھاڑیوں کی وجہ سے بھاگا بھی نہیں جا رہا تھا۔ یہاں سے کیمپ کوئی آدھ میل تھا۔ میں نے بندوق پھینک دی اور اپنی زندگی کی سب سے تیز دوڑ شروع کر دی۔ پنڈلیوں میں ٹیسیں اُٹھنے لگیں۔ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ پیٹ میں سانس سمانی مشکل ہو گئی مگر میں بھاگتا ہی رہا۔

کچھ دُور بھاگنے کے بعد محسوس ہوا کہ شاید میں اسے پیچھے چھوڑ آیا ہوں لیکن اچانک بڑے زور سے 'دھپ' کی آواز آئی - وہ کم بخت اب سر پر ہی آ پہنچا تھا - اب تو اُس کی سانس کی آواز بھی مجھے سُنائی دے رہی تھی - پہلے تو وہ صرف میری بُو کا پیچھا کر رہا تھا اِس لیے اُس کی رفتار تیز نہیں تھی لیکن اب تو اُس نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔

میں نے رفتار اور تیز کر دی لیکن اُس کی دھپ دھپ کی آواز قریب ہی آتی گئی - ہر لمحے مجھے یہ محسوس ہوتا کہ اب اس کا پنجہ مجھ پر پڑا ــــ میرے بھاگنے کی طاقت جواب دے چکی تھی اور قریب تھا کہ اِنتہائی مایُوسی کے عالم میں مَیں اپنے آپ کو اُس کے حوالے کر دُوں کہ اچانک یُوں محسوس ہُوا جیسے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے اور میں نیچے گر رہا ہُوں - نیچے گرتے ہی میں بے ہوش ہو گیا۔

لیکن چند ہی منٹ بعد مجھے ہوش آ گیا اور ایک تیز اور شدید بدبُو کا اِحساس ہُوا جو ناک کے نتھنے چیرتی اندر گُھسی جا رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کیا تو جو چیز سب سے پہلے ہاتھ لگی وہ گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا تھا۔ دُوسرے ہاتھ میں ایک [illegible] ہڈی آ گئی - میں نے اُوپر نظر ڈالی تو گولائی میں آسمان نظر آ رہا تھا جس میں تارے چمک رہے تھے۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ میں ایک گڑھے میں گر پڑا ہوں - میں جلدی سے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ، پیر، گردن وغیرہ ہلا کر دیکھنے لگا - شکر ہے کہ سب سلامت تھے - البتّہ سارے جسم میں سخت درد تھا - مجھے یاد آ گیا کہ کس طرح ایک دیو میرا پیچھا کر رہا تھا - میں نے گھبرا کر اُوپر دیکھا کہ شاید وہ کم بخت اب تک وہاں موجود ہو لیکن کچھ نظر نہ آیا اور نہ کسی قسم کی آواز ہی سُنائی دی -

میں نے اِدھر اُدھر پھر کر جائزہ لیا تو پتا چلا کہ یہ غار تقریباً بیس فُٹ کے دائرے میں ہے - دیواریں سخت ڈھلوان اور چکنی تھیں - نیچے ہڈیاں بکھری ہُوئی تھیں اور گوشت کے ٹکڑے پڑے تھے - کچھ ٹکڑے سڑ چکے تھے اور اُن سے سخت بدبُو اُٹھ رہی تھی - گڑھے کے درمیان میں ایک لمبی لکڑی گڑی ہُوئی تھی - میں نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر ہاتھ بڑھایا تب بھی وہ اُس کے اُوپر کے سرے تک نہ پہنچ سکا - لکڑی بڑی چکنی تھی میں نے سُونگھ کر دیکھا تو پتا چلا کہ اِس پر چربی ملی گئی ہے -

اتنے میں مجھے یاد آیا کہ میری جیب میں ایک مومی ماچس پڑی ہے - جلدی سے اُسے نکال کر ایک تیلی جلائی اور فوراً اِس نتیجے پر پہنچ گیا کہ یہ گڑھا انسانوں نے شکار کے لیے کھودا ہے - وہ اس کے اُوپر گھاس پُھوس رکھ کر اسے چُھپا دیتے ہوں گے - جانور کا پیر پڑتا ہو گا تو وہ اِس میں گر پڑتا ہو گا - یہ لکڑی اُوپر سے

تیز نوکیلی ہوگی۔ جانور اس میں چھد کر ہلاک ہو جاتا ہوگا۔

چیلنجر کا خیال تھا کہ یہاں انسان کی موجودگی ممکن نہیں کیونکہ جنگلی آدمی جس کے پاس اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار نہ ہوں اتنے بڑے بڑے درندوں کے درمیان زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن مجھے اب ایسے ثبوت مل چکے تھے جن سے چیلنجر کا خیال غلط ثابت ہوتا تھا۔ ایک غاروں میں نظر آنے والی روشنی اور دوسرا شکار کا یہ گڑھا۔

ان ڈھلوان دیواروں پر سے چڑھ کر میں اوپر آ سکتا تھا مگر یہ ڈر تھا کہ جو جانور میرا پیچھا کر رہا تھا وہ کہیں تاک میں نہ بیٹھا ہو میں سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے سمرلی اور چیلنجر کی وہ گفتگو یاد آ گئی جو وہ ان جانوروں کے بارے میں کر رہے تھے۔ انھوں نے بتایا تھا کہ یہ جانور جتنے بڑے ہوتے ہیں ان میں عقل اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ اسی لیے تو وہ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال نہ سکے اور دنیا میں ختم ہو گئے۔

اب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جانور واپس چلا گیا ہوگا۔ چنانچہ میں اوپر آ گیا۔ تاروں کی روشنی مدھم پڑنے لگی تھی صبح قریب تھی۔ میں جس راستے آیا تھا اسی پر چل پڑا۔ چلتے چلتے مجھے ٹھوکر لگی۔ جھک کر دیکھا تو یہ ایک نالی بندوق تھی جو میں نے بھاگتے ہوئے پھینک دی تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور چشمے تک

پہنچ گیا جو ہمارے کیمپ کے قریب پہنچتا تھا۔

ابھی میں کیمپ کی طرف چند ہی قدم گیا تھا کہ مجھے رائفل کی گولی چلنے کی آواز آئی۔ میں ٹھٹھک گیا۔ پہلے تو مجھے خیال آیا کہ شاید میرے ساتھی کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں مگر پھر سوچا کہ شاید انھوں نے یہ سمجھا ہو کہ میں راستہ بھول کر جنگل میں بھٹک رہا ہوں اور انھوں نے گھر کی سمت بتانے کے لیے گولی چلائی ہو۔ بہرحال میں نے اپنی چال تیز کر دی تاکہ جلد سے جلد اپنے ساتھیوں سے جا ملوں۔

جب فورٹ چیلنجر قریب آ گیا تو میں نے لارڈ جان کو زور سے آواز دی تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ میں زندہ سلامت ہوں۔ لیکن جب اس کے جواب میں خاموشی چھائی رہی تو میں فکرمند ہو گیا اور تیزی سے کیمپ کی طرف دوڑا۔ قلعے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں لپک کر اندر گھسا اور صبح کے جھٹ پٹے میں میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کے لیے میں ہرگز تیار نہ تھا۔ سارا سامان بکھرا پڑا تھا۔ میرے تینوں ساتھی غائب تھے اور بجھے ہوئے الاؤ کے پاس بہت سا خون پڑا ہوا تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا مجھے پوری طرح یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے کہ میں دیوانوں کی طرح جنگل میں اپنے ساتھیوں کو پکارتا پھر رہا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ اب میں اس خطرناک

جگہ اکیلا رہ گیا ہوں اور جلد ہی کسی حادثے کا شکار ہو جاؤں گا۔ مایوسی کے عالم میں میں کبھی اپنا سر پیٹتا تھا اور کبھی بال نوچتا تھا۔

تھک ہار کر میں پھر کیمپ میں واپس آیا اور اپنے حواس ٹھیک کر کے اندازہ لگانے لگا کہ یہ ہوا کیا؟ سامان کی بے ترتیبی بتاتی تھی کہ کیمپ پر حملہ ہوا ہو گا۔ رائفل چلنے کی آواز اسی وقت آئی ہو گی۔ لیکن صرف ایک ہی گولی چلائی گئی جس کا مطلب ہے کہ تینوں کو بہت جلد بے قابو کر دیا گیا۔ رائفلیں زمین پر پڑی تھیں۔ لارڈ جان کی رائفل میں خالی کارتوس لگا تھا۔ سمرلی اور چیلنجر کے کمبل الاؤ کے پاس پڑے تھے، جہاں وہ سوئے تھے باقی سارا سامان بھی بکھرا پڑا تھا مگر کوئی چیز غائب نہ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ حملہ جانوروں نے کیا تھا۔ انسان ہوتے تو وہ کچھ سامان ضرور ساتھ لے جاتے۔

میں دوبارہ انھیں جنگل میں ڈھونڈنے گیا اور اس بار راستہ بھی بھول گیا۔ آخر گھنٹا بھر بھٹکنے کے بعد چشمے تک پہنچا اور وہاں سے کیمپ آ گیا۔ ساتھیوں کا کچھ پتا نہ چلا۔

اتنے میں مجھے زمبو کا خیال آیا جو نیچے موجود تھا۔ میں سطح مرتفع کے کنارے پر گیا۔ زمبو بیٹھا تھا اور اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ مخروطی پہاڑی پر آ گیا اور

اس نے بتایا کہ جن ملازموں کو ہم نے واپس بھیجا تھا ان میں سے ایک کا سامان دوسروں نے چھین لیا چنانچہ وہ واپس آ گیا ہے اور آپ کوئی خط بھیجیں تو لے جائے گا۔

میرے پاس دو خط تو تیار تھے۔ تیسرا خط لکھنے کے لیے مہلت درکار تھی۔ اس لیے میں نے زمبو سے شام کو آنے کو کہا اور اب تک کے واقعات لکھنے بیٹھ گیا۔ شام کو زمبو آیا تو میں نے تینوں خط ایک پتھر میں باندھ کر اس تک پھینک دیے اور اپنا بٹوا بھی پھینک دیا جس میں تین اشرفیاں تھیں۔ میں نے کہا۔

"یہ اشرفیاں اس آدمی کو دے دو اور کہو کہ گاؤں سے چمڑے کے بنے ہوئے لمبے لمبے رسّے لے آئے تو دو گنا انعام ملے گا۔"

بن مانسوں کی قید میں

میں بے حد دکھی ہوا تھا اور ساتھیوں کی گم شدگی کا غم اس سے بھی زیادہ جان لیوا تھا۔ کیمپ میں قطعاً جی نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن رات کے وقت جنگل میں نکلنے کی بھی کوئی تک نہیں تھی۔ یہ بھی خطرہ تھا کہ جو جانور کل رات آیا تھا وہ شاید آج پھر آ نکلے۔ یہ سوچ کر میں نے کھانا کھا کر ایک کے بجائے تین الاؤ مثلث کی شکل میں جلائے اور ان کے درمیان میں لیٹ گیا۔ جلد ہی آنکھ لگ گئی۔

صبح کو پو پھٹ رہی تھی کہ کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا میں ہڑبڑا کر اٹھا اور فوراً رائفل پر ہاتھ ڈالا لیکن دوسرے ہی لمحے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ میرے پاس لارڈ جان گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے ـــــ میں نے آنکھیں مل کر انھیں دیکھا۔ سچ مچ وہ لارڈ جان ہی تھے لیکن اُف میرے خدا ـــــ کل کے لارڈ جان اور آج کے لارڈ جان میں کتنا فرق تھا۔ ان کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں پھٹی پھٹی تھیں۔ سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ چہرے پر کھروچے پڑے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ خون نکل کر جم گیا تھا اور کپڑے پھٹ کر تار تار ہو چکے تھے۔

میں ان سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر انھوں نے اس کی مہلت ہی نہ دی۔ دو رائفلیں خود سنبھالیں۔ دو مجھے دیں۔ پھر جلدی جلدی جیبوں میں کارتوس بھرے اور بولے۔

"جلدی کرو۔ کچھ کھانے پینے کا سامان اور زیادہ سے زیادہ کارتوس ساتھ لے لو۔ اور جلدی چلو۔"

آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے میں تقریباً بھاگتے ہوئے روانہ ہوئے۔ وہ مجھے بائیں طرف اس علاقے میں لے گئے جہاں گھنی جھاڑیاں تھیں۔ جھاڑیوں کے درمیان ذرا سی صاف جگہ تھی۔ یہاں انھوں نے ایک پناہ گاہ بنائی تھی۔ کیمپ تو اب غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر ہم نے سب سامان رکھا اور پھر لارڈ جان سے پوچھا۔

"چیلنجر اور سمر لی کہاں ہیں؟ آخر یہ قصہ کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا "کچھ نہ پوچھو۔ یہ بن مانس تو اس قدر وحشی ہیں کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اور ہاں آہستہ بولو۔ ان کم بختوں کے کان بڑے تیز ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر انھوں نے مجھے پورا قصہ سنایا۔ کہنے لگے۔

"صبح ہونے والی تھی۔ ہم لوگ جاگ چکے تھے لیکن ابھی اٹھے

نہیں تھے کہ اچانک درخت پر سے بن مانس کُودنا شروع ہو گئے۔ وہ تعداد میں اِتنے زیادہ تھے کہ ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ میں نے ایک بن مانس کے گولی مار دی جو اُس کے پیٹ میں لگی لیکن اِس سے زیادہ موقع نہ مِل سکا۔ میں نے اپنی زندگی میں اِتنے ذہین جانور نہیں دیکھے۔ وہ ڈنڈوں اور پتھروں سے مسلّح تھے اور آپس میں باقاعدہ باتیں کرتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہمارے ہاتھ پُشت پر لا کر اُنھوں نے پتلی پتلی بیلوں سے کس کر باندھ دیے۔ کم بخت بلا کے طاقت ور تھے۔ ان میں کچھ بن مانس اپنے زخمی ساتھی کو اُٹھا کر لے گئے۔ بعد میں بڑے بوڑھے بن مانسوں کی ایک کانفرنس ہوئی۔"

میں نے بے چینی سے پُوچھا، "پھر کیا ہُوا؟"

لارڈ جان نے اپنا بیان جاری رکھتے ہُوئے کہا۔ "چیلنجر اُچھل اُچھل کر اور چیخ چیخ کر اُنھیں کوسنے دے رہا تھا۔ میں تو یہ سمجھا کہ بس اب یہ ہمیں مار ڈالیں گے مگر وہ آپس میں باتیں ہی کرتے گئے۔ اور ہاں ایک مزے کی بات تو میں نے بتائی ہی نہیں۔ اُن کا سردار ہُو بہُو چیلنجر کی طرح تھا۔ ویسا ہی جسم، وہی گردن اور اُسی سے ملتا جلتا چہرہ — حتّٰی کہ داڑھی تک اُسی طرح کی تھی۔ شاید وہ لوگ بھی اشارے کر کر کے اِسی کا ذکر کر رہے تھے اِس لیے کہ اُن کا سردار چیلنجر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے چیلنجر کی

گردن کے گرد اپنا بازو ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر اس حالت میں بھی سمرلی پر قہقہوں کا دورہ پڑ گیا جس سے چیلنجر کو غصّہ آ گیا اور وہ سمرلی پر بکنے جھکنے لگا۔

"پھر کیا ہُوا؟" میں اِس تفصیل سے جھنجھلا اُٹھا تھا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ سمرلی اور چیلنجر زندہ ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کہاں ہیں۔ لارڈ جان نے بتایا۔ "آخر وہ لوگ ہمیں لے چلے۔ مجھے اور سمرلی کو تو پیدل لے جایا گیا لیکن چیلنجر کو چار بن مانسوں نے اپنے کندھوں پر اُٹھا لیا۔ بالکل یُوں لگتا تھا جیسے کسی شہنشاہ کی سواری جا رہی ہو۔"

لارڈ جان نے اِتنا ہی کہا تھا کہ دُور سے ایک آواز سُنائی دی جیسے کوئی چیز ایک دُوسرے سے ٹکرا کر بجائی جا رہی ہو۔ لارڈ جان نے کہا "یہ وہی بن مانس ہیں۔ غصّے میں سب مِل کر اپنے دانت کٹکٹاتے ہیں تو ایسی ہی آواز آتی ہے۔ اُن کی ٹولیاں ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔ آواز مت نکالو۔"

ہم نے رائفلیں سنبھال لیں اور دبک کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ آوازیں دُور چلی گئیں اور پھر غائب ہو گئیں۔ اِس کے بعد لارڈ جان نے پھر اپنی داستان شروع کی۔

"وہ لوگ تین چار میل دُور ہمیں اپنی بستی میں لے گئے۔ وہاں درختوں کے ایک بڑے جھنڈ تلے اُن کی کم سے کم ایک ہزار

جھونپڑیاں ہیں۔ وہاں اُنھوں نے مجھے اور سمرلی کو اُٹھا کر کے درختوں سے باندھ دیا۔ لیکن چیلنجر کی بڑی خاطریں ہو رہی تھیں۔ اُسے طرح طرح کے پھل کھلائے جا رہے تھے اور وہ بڑا خوش تھا بن مانسوں کے سردار کے ساتھ اُس کا وقت بڑے مزے میں گزر رہا تھا۔"

میں لارڈ جان کو مختصر طور پر بتا چکا تھا کہ یہاں آدمی بھی موجود ہیں لیکن انھیں مجھ سے زیادہ باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اُنھوں نے بتایا۔

"اِس علاقے کے ایک جانب اِنسان بستے ہیں اور دُوسری طرف بن مانسوں کا راج ہے اور دونوں میں سخت دُشمنی ہے۔ کل بن مانس ایک درجن اِنسانوں کو کہیں سے پکڑ لائے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور سُرخ رنگ کے اِنسان تھے۔ بن مانسوں نے جگہ جگہ کاٹ کر اور نوچ کر اُنھیں اِتنا زخمی کر دیا تھا کہ اُن سے چلا بھی نہ جاتا تھا۔ میرے سامنے دو بن مانسوں نے ایک آدمی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے اور دو ٹکڑے کر ڈالا۔ کسی کو قتل کرنے کا اِس سے زیادہ ظالمانہ طریقہ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ سمرلی تو بے ہوش ہو گیا اور چیلنجر کی بھی حالت خراب ہو گئی۔"

"تم خوش قسمت ہو کہ بن مانسوں کے ہاتھوں سے بچ گئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

"تمھیں اُس سطحِ مُرتفع کے نیچے وہ بانسوں کا جھنڈ یاد ہے جس میں اُلجھا ہوا سفید فام باشندے کا ڈھانچا ملا تھا۔"

"ہاں ہاں۔"

"بانسوں کا یہ جھنڈ بن مانسوں کی بستی کے عین نیچے ہے۔ یہاں سے وہ اپنے قیدیوں کو نیچے پھینک کر تماشا دیکھتے ہیں۔ اگر ہم بانسوں کے اُس بڑے جھنڈ کا اچھی طرح جائزہ لیں تو ہمیں وہاں بہت سی اِنسانی ہڈیاں ملیں گی۔"

یہ سُن کر خوف کی ایک ٹھنڈی لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ لارڈ جان نے کہا۔

"بن مانس اِس تماشے کا باقاعدہ اِنتظام کرتے ہیں۔ اُن کی پوری قوم قطار باندھ کر تماشا دیکھنے کنارے پر موجود تھی۔ مجھے اور سمرلی کو بھی وہاں لے جایا گیا۔ اُنھوں نے چار اِنسانوں کو ایک ایک کر کے کُودنے پر مجبور کیا اور چاروں کے جسم تیز نوکیلے بانسوں میں چھِد کر رہ گئے۔ چھ اِنسانوں کو اُنھوں نے آج کے لیے بچا لیا اور میرے خیال میں مجھے اور سمرلی کو بھی وہ آج ہی پھینکنے والے تھے۔ چیلنجر کو شاید نہ پھینکتے۔"

"پھر آپ کیسے بچ نکلے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے یہ تاڑ لیا تھا کہ بھلے ہی یہ بن مانس ہم سے زیادہ طاقتور ہوں، کم سے کم ہم سے زیادہ تیز دوڑ تو نہیں سکتے۔ اِس لیے کہ

ان کی ٹانگیں خم کھائی ہوئی تھیں۔ دوسرے یہ کہ انھیں بندوق کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اگر انھیں یہ معلوم ہو جاتا کہ ان کا ایک ساتھی میری بندوق سے مارا گیا ہے تو وہ ساری بندوقیں توڑ ڈالتے۔ اِس لیے میں نے سوچا کہ بندوقیں ہماری ہاتھ آ جائیں تو بچنے کا موقع ہے۔"

"بس آج صبح میں نے موقع پا کر اپنے پہرے دار بن مانس کے پیٹ میں زور سے لات ماری اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، میں بھاگ کر تمھارے پاس پہنچ گیا۔"

"اور سمرلی اور چیلینجر کیوں نہیں بھاگے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"سمرلی تو اس قابل ہی نہ تھا اور چیلینجر درخت پر بن مانسوں کے سردار کے ساتھ تھا۔ وہاں سے اتر کر بھاگنا مشکل تھا۔"

ظاہر ہے کہ اپنے ساتھیوں کو بچانے کی کوشش ضروری تھی ہم نے بندوقیں سنبھالیں۔ کارتوس ہماری جیبوں میں پہلے سے موجود تھے مگر جیسے ہی ہم باہر نکلے لارڈ جان نے گھبرا کر کہا۔ "بن مانس آ پہنچے۔"

میں نے جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھا۔ کچھ دور پر بن مانسوں کی ایک ٹولی قطار بنائے جا رہی تھی۔ وہ دائیں بائیں دیکھتے جاتے تھے جیسے ہماری تلاش میں ہوں۔ سب کے ہاتھوں میں موٹے موٹے

ڈنڈے تھے۔

ہم لوگ دوبارہ اپنی پناہ گاہ میں دبک گئے اور خوراک کا ایک ڈبا کھول کر ناشتا کرنے لگے۔ جب خطرہ ٹل گیا تو احتیاط سے دوبارہ باہر نکلے۔ آگے آگے لارڈ جان تھے اور پیچھے پیچھے میں۔ کچھ دور چل کر لارڈ جان رکے اور انھوں نے آہستہ سے کہا۔

"درختوں میں وہ ہم پر بھاری پڑیں گے۔ ہمیں پتا بھی نہیں چلے گا اور وہ اچانک اوپر سے ہم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ میدان میں ہم زیادہ محفوظ رہیں گے اِس لیے کوشش کرو کہ ہم میدان ہی میدان آگے بڑھیں۔"

آخر ہم ایک چکر کھا کر میدان میدان چلے اور ان کی بستی کے پاس پہنچ گئے۔ بن مانس قطار باندھے کھڑے تھے اور کوئی بھی قطار توڑنے کی کوشش نہ کر رہا تھا۔ پانچ چھ جنگلی آدمی سہمے ہوئے وہاں موجود تھے۔ میں نے چیلینجر کو بھی دیکھا۔ اس کے کپڑے تار تار ہو چکے تھے اور ہیٹ غائب تھا۔ اس کے قریب ہی بن مانسوں کا سردار کھڑا تھا اور واقعی لارڈ جان نے ٹھیک کہا تھا۔ دونوں میں بال برابر فرق نہ تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دو بن مانسوں نے ایک جنگلی آدمی کو پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے کنارے کی طرف لے چلے۔ وہاں پہنچ کر ایک نے اس غریب کا ایک ہاتھ پکڑا، دوسرے نے ایک

ٹانگ اور بن مرتبہ جھلا کر زور سے اچھال دیا۔ ایک چیخ بلند ہوئی
جو ڈوبتی چلی گئی۔ بن مانس مارے خوشی کے کودنے اور شور
مچانے لگے۔

وہ اس تماشے میں اتنے محو تھے کہ انھوں نے ہماری طرف
توجّہ نہیں کی اور ہم ان کے بہت قریب پہنچ گئے۔ اب دو
بن مانسوں نے سمرلی کو پکڑا اور اسی طرح گھسیٹتے ہوئے لے چلے۔
چیلنجر ان کے سردار کی منتیں اور خوشامدیں کرتا رہا مگر اس کے
کان پر جوں تک نہ رینگی۔ سردار نے اسے ایک طرف دھکیل دیا
اور نفی میں سر ہلا دیا۔

دوسرے ہی لمحے لارڈ جان کی رائفل سے ایک شعلہ نکلا اور
بن مانسوں کا سردار زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ لارڈ جان نے مجھ
سے کہا۔

"گولی چلاؤ بیٹے۔ دیکھتے کیا ہو۔"

میں یوں تو کافی رحم دل ہوں اور خون بہانا مجھے پسند نہیں لیکن
اس وقت تو میرے سر پر جنون سوار تھا۔ بڑی تیزی سے میں گولیاں
چلانے لگا۔ لارڈ جان مجھ سے بھی زیادہ تیزی سے ایک کے بعد
دوسرا کارتوس خالی کر رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ دو بن مانس
مارے گئے جو سمرلی کو پکڑے ہوئے تھے اور پھر تلے اوپر جو لاشیں
گرنا شروع ہوئیں تو بن مانسوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چیختے چلاتے

پناہ لینے کے لیے درختوں کی طرف بھاگے۔

چیلنجر نے سمرلی کا بازو تھاما اور وہ دونوں ہماری طرف
دوڑے۔ دو بن مانس ان کے پیچھے بھاگے مگر لارڈ جان کی دو گولیوں
نے ان کا بھی خاتمہ کر دیا۔ ہم چاروں بندوقیں ساتھ لائے تھے۔
چیلنجر اور سمرلی کے آتے ہی ان کی بندوقیں ہم نے انھیں دے دیں
لیکن بے چارہ سمرلی بندوق چلانے کے قابل ہی نہ تھا۔

اب بن مانس بھی سنبھل گئے اور وہ ایک بڑا سا حلقہ بنا کر
ہماری طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے اور چیلنجر نے سمرلی کو بیچ
میں لے لیا اور سہارا دیتے ہوئے دوڑنے لگے۔ لارڈ جان پیچھا
کرنے والے بن مانسوں کو روکنے کے لیے ان پر گولیاں بھی برساتے
جا رہے تھے اور بھاگتے بھی جا رہے تھے۔ کوئی ایک میل تک
انھوں نے ہمارا پیچھا کیا مگر پھر انھیں بندوق کی طاقت کا علم ہو گیا
اور وہ لوٹ گئے۔ ہم لوگ کیمپ میں پہنچ گئے لیکن عین اسی وقت
قدموں کی آواز آئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا تو وہ چاروں جنگلی آدمی
جو بچ گئے تھے بے تحاشا بھاگتے چلے آ رہے تھے۔ ہمارے
سامنے آ کر وہ ہاتھ جوڑ کر پیٹ کے بل لمبے لمبے لیٹ گئے۔ خوف
سے ان کے بدن کانپ رہے تھے۔

ان میں سے ایک بڑھ کر لارڈ جان کے پیروں سے لپٹ گیا۔
اور جب لارڈ جان نے اسے اٹھایا تو اس نے اشارے سے بتایا

کہ اس جنگل میں ٹھہرنا سخت خطرناک ہے۔ ہم نے اپنی بندوقوں کی طرف اِشارہ کر کے اُنھیں تسلی دی کہ اس سے ہم ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اِس پر وہ چاروں ہٹ کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ سمرلی نے میرا اور لارڈ جان کا شکریہ ادا کیا کہ ہم نے اُن کی جان بچائی۔ چیلنجر کہنے لگے۔

"تمھارا یہ احسان سائنس کی گردن پر ہے۔ مجھ جیسے آدمی کی موت سے سائنس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔"

یہ کہہ کر چیلنجر نے گوشت کا ایک ٹین کھولا اور مر بھکوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑے۔ چاروں جنگلی پھر دوڑ کر لارڈ جان کے قدموں سے لپٹ گئے اور خوف زدہ ہو کر چیلنجر کی طرف اِشارہ کرنے لگے۔ لارڈ جان نے ایک زور دار قہقہہ لگا کر چیلنجر سے کہا۔

"لو اور سنو، یہ غریب تمھیں بن مانس سمجھ کر ڈر رہے ہیں اور یقین جانو تم میں اور بن مانسوں کے سردار میں ذرہ برابر فرق نہیں۔"

"مجھے معلوم تھا کہ جنگلی اس علاقے کے دوسرے کنارے پر آباد ہیں جو یہاں سے کوئی بیس میل دور تھا۔ ہم نے سوچا کہ ہمارے لیے بھی وہی جگہ محفوظ ہو گی۔ ہم نے اپنا سامان سنبھالا اور روانہ ہو گئے۔ سمرلی کی حالت خراب تھی۔ اُنھیں ہمارے سہارے چلنا پڑ رہا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ہم نے بن مانسوں کی آوازیں سُنیں لیکن وہ ہمارے سامنے نہیں آئے۔ شاید ڈر گئے تھے۔ لیکن اپنی جگہ ہم بھی

خوف زدہ تھے۔ اس لیے کہ اگر وہ بڑی تعداد میں ایک ساتھ ہم پر ہلا بول دیتے تو ہماری چار بندوقیں کیا کر لیتیں؟

کیمپ سے نکل کر ہم اپنی نئی پناہ گاہ میں پہنچ گئے اور ایک ایک نیند لے لینے کا فیصلہ کیا۔ چاروں جنگلی بھی سو گئے۔ سمرلی کو تو سب سے پہلے نیند آئی۔ لارڈ جان بھی سو گئے۔ میں ابھی اونگھ ہی رہا تھا کہ کسی نے میری آستین پکڑ کر کھینچی۔ دیکھا تو چیلنجر تھے۔ بڑے دوستانہ لہجے میں مجھ سے کہنے لگے۔

"تم یہاں کے سارے واقعات لکھ رہے ہو۔ کیوں؟"

"بے شک۔ اخباری رپورٹروں کا اور کام ہی کیا ہے؟"

"تم نے لارڈ جان کی وہ بات سنی ہو گی۔ وہی بن مانسوں سے میری مشابہت والی؟"

میں نے سر ہلایا تو چیلنجر نے آہستہ سے ہدایت کی۔ اپنی رپورٹ میں اس کا ذکر مت کرنا۔ یہ فضول سی بات ہے ــ بالکل واہیات۔"

یہ ہدایت دینے کے بعد چیلنجر پھر لیٹ گئے اور اطمینان سے خرّاٹے لینے لگے۔ جلد ہی میری بھی آنکھ لگ گئی۔

اپنا مسکن تصور کرے گی اور اُن کی پناہ میں پہنچنے کے بعد ہم اطمینان سے جیل وہائیٹ لینڈ کے بارے میں اپنی تحقیق مکمل کر لیں گے۔ اس کے بعد یہاں سے واپسی کے بارے میں سوچیں گے۔

یہ جنگلی چھوٹے قد کے دُبلے پتلے، کمزور سے آدمی تھے لیکن ان میں بلا کی پھرتی تھی۔ اپنے بالوں کو پیچھے کر کے انھوں نے چمڑے کی پٹیوں سے کس رکھا تھا۔ اور وہ چمڑے کی ہی لنگوٹیاں باندھتے تھے۔ ان کے ڈاڑھی مونچھیں نہیں تھیں اور کانوں کی لویں چری ہوئی اور زخمی تھیں جن سے پتا چلتا تھا کہ وہ کوئی زیور پہنے ہوئے تھے جسے بن مانسوں نے کھینچ کر نکال لیا تھا۔ ان کی زبان ہماری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ لیکن وہ آپس میں بڑی روانی سے بات چیت کرتے تھے۔ بار بار وہ اپنی اور ایک دُوسرے کی طرف اِشارہ کر کے لفظ "اکالا" کہتے تھے۔ جس سے ہم سمجھ گئے کہ وہ اپنی قوم کو اکالا کہتے ہیں۔ مٹھیاں بھینچ بھینچ کر وہ جنگل کی طرف اِشارہ کر کے لفظ "ڈوڈا ڈوڈا" چلاتے تھے یعنی اپنے دُشمن بن مانسوں کو وہ ڈوڈا کہتے تھے۔

لارڈ جان نے کہا۔ "چیلنجر، تمھارا اِن لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

چیلنجر نے جواب دیا۔ "ان میں یہ آدمی جس کا سر مُنڈا ہوا ہے، ان کا سردار معلوم ہوتا ہے۔"

خوف ناک جنگ

ہمارا خیال تھا کہ بن مانسوں کو ہماری اِس پناہ گاہ کا کوئی علم نہ ہوگا لیکن جلد ہی ہمیں اپنی اِس غلطی کا احساس ہو گیا۔ جنگل میں بالکل خاموشی تھی۔ حتّیٰ کہ پتا کھڑکنے کی آواز بھی نہ آتی تھی لیکن جیسا کہ ایک مرتبہ پہلے تجربہ ہو چکا تھا۔ بن مانس پُورا منصوبہ بنا کر اچانک حملہ کرنے کے عادی تھے۔ غرض اس صُبح موت میرے جتنی نزدیک سے گزری اِتنی نزدیک اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی ـــ ٹھہریے یہ بات میں ذرا تفصیل سے بتاؤں گا۔

صُبح کو ہم سب اُٹھے تو پُوری طرح تازہ دم نہیں ہوئے تھے اور سمرلی کی تو ویسے بھی طبیعت خراب تھی لیکن بوڑھا ہمّت کا پُتلا تھا۔ ایسی ہمّت جو کبھی شکست نہیں کھاتی۔

ہم نے طے کیا کہ ناشتا کر کے جنگلیوں کے غاروں کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ جن چار آدمیوں کی ہم نے جان بچائی تھی ان کا رواں رواں ہمارا شکر گزار تھا اور ہمیں یقین تھا کہ ان کی پُوری بستی ہمیں

اور یہ واقعہ تھا کہ وہ آدمی باقی تینوں سے الگ رہتا تھا باقی تینوں اُس سے بات کرتے تو بڑے ادب سے کرتے تھے۔ وہ اِن سب سے کم عمر تھا۔ اس کے باوجود بڑا مغرور تھا۔ جب چلینجر نے اس کے مُنڈے ہوئے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ غصے سے کچھ کہتا ہوا الگ ہٹ گیا۔ پھر ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر بڑے فخر سے اس نے کئی بار لفظ "ماریتاس" کہا۔

چلینجر نے سمجھایا کہ یہ اِنسانی نسل جنُوبی امریکہ کے دُوسرے جنگلی قبیلوں کے مقابلے میں ذہنی طور پر زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اِسی طرح یہاں کے بن مانس بھی دُنیا میں پائے جانے والے بندروں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ہیں۔ اس جگہ جہاں جانور ابھی ارتقا کی بالکل ابتدائی منزلوں میں ہیں، اِن دو ترقی یافتہ نسلوں کا وجُود اس کا ثبوت ہے کہ یہ لوگ کسی طرح باہر سے یہاں پہنچے اور پھر لوٹ کر نہ جا سکے۔

یہ سُن کر مجھے جھرجھری سی آگئی۔ گویا ہم بھی یہاں سے واپس نہ جا سکیں گے۔ چلینجر کی تقریر خاصی دیر جاری رہی جس سے سمرلی نے اِختلاف کیا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ بات بڑھ نہ جائے ان کی توجہ دُوسری طرف ہٹانے کے لیے کہا۔ "ارے، چوتھا جنگلی کہاں غائب ہو گیا؟"

لارڈ جان نے بتایا "میں نے اُسے گوشت کا ایک خالی ڈبا دے کر چشمے سے پانی لانے بھیجا ہے۔ آتا ہی ہو گا۔"

لیکن جب اُسے آنے میں خاصی دیر ہو گئی تو میں رائفل لے کر اُسے ڈھونڈنے نِکلا۔ چشمہ وہاں سے کوئی دو سو گز دُور تھا۔ چشمے کے بہنے کی آواز آ رہی تھی۔ درختوں کا آخری جُھنڈ میرے اور چشمے کے درمیان تھا کہ اچانک میری نظر اس جُھنڈ کے نیچے زمین پر کسی لال لال چیز پر پڑی۔ قریب جا کر دیکھا تو یہ اُسی جنگلی کی لاش تھی۔ اُس کا ایک ہاتھ شانے پر سے اُکھڑا ہوا تھا اور گردن مروڑ دی گئی تھی۔ میں نے چیخ مار کر اپنے ساتھیوں کو ہوشیار کیا اور پناہ گاہ کی طرف بھاگا۔ میرے مرنے میں کچھ کسر نہیں رہ گئی تھی مگر خدا جانے کس وقت کی نیکی کام آگئی کہ اچانک میری نظر اُوپر اُٹھ گئی اور میں جھٹ سر جُھکا کر بچ گیا۔ دو لال لال ہاتھ میرا گلا گھونٹنے کے لیے بڑھ رہے تھے۔ ایک بن مانس درخت کی ڈال میں اُلٹا لٹک کر یہ حرکت کرنے والا تھا۔

اس سے تو میں بچ گیا لیکن اس کے بعد اُس نے کچھ اور نیچے آ کر ایک ہاتھ میری گُدی میں ڈال دیا اور دُوسرا میرے چہرے پر رکھ کر مجھے زمین سے اُٹھا لیا۔ پھر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرا سر پیچھے کی طرف موڑا جا رہا ہے۔ مجھے اِتنی شدید تکلیف ہوئی کہ حواس جاتے رہے۔ اِس کے باوجود میں دونوں ہاتھوں سے اُس کا ہاتھ جس نے میری ٹھوڑی کو پکڑ رکھا تھا ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور کانوں میں گھنٹیوں

کی سی مدھم آواز آ رہی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ میں مرنے والا ہوں کہ اچانک گولی چلنے کی آواز آئی اور پھر ان ہاتھوں نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں زمین پر گر کر بے ہوش ہو گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں پناہ گاہ میں لیٹا ہوا تھا۔ لارڈ جان میرے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہے تھے۔ نہ جانے ان میں سے کون جا کر پانی لایا تھا۔ غرض کوئی آدھ گھنٹے میں میں ٹھیک ہو گیا صرف گردن میں درد باقی تھا۔

لارڈ جان نے بتایا۔ "تمھاری چیخ سن کر میں بندوق لے کر باہر نکلا۔ میں نے دیکھا بن مانس تمھارا سر مروڑ رہا ہے۔ میں تو سمجھا کہ ہم میں سے ایک گیا۔ تاہم میں نے گولی چلا دی۔ نشانہ خطا ہو گیا لیکن بن مانس ڈر کے مارے تمھیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

اب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ بن مانسوں نے ہماری پناہ گاہ ڈھونڈ نکالی ہے۔ وہ اِدھر اُدھر تاک میں لگے ہوئے تھے تاکہ کوئی اکا دکا آدمی باہر نکلے تو اسے مار ڈالیں۔ ایک جنگلی کو انھوں نے مار ہی ڈالا۔ میں بھی مرتے مرتے بچا تھا۔ لہٰذا اب فوراً یہاں سے چل دینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

ہمیں اپنا پچھلا کیمپ فورٹ چیلنجر چھوڑنے کا غم تھا۔ اس لیے بھی کہ وہاں اب بھی کافی سامان تھا اور اس لیے بھی کہ وہاں سے ہم زمبو سے مدد لے سکتے تھے لیکن ہمیں یقین تھا کہ موقع پا کر ہم

دوبارہ اپنے قلعے میں واپس آ سکیں گے۔

سب سے آگے نوجوان جنگلی سردار تھا جو ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ اُس نے سامان اُٹھانے سے اِنکار کر دیا تھا۔ اُس کے پیچھے دو جنگلی تھے جو ہمارا سامان اُٹھائے ہوئے تھے۔ اُن کے پیچھے ہم چاروں تھے۔ ہمارے پاس بھری ہوئی بندوقیں تھیں اور بڑی احتیاط سے ہر طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ کوئی گیارہ بجے دن کو ہم روانہ ہوئے تھے۔

جب ہم جنگل پار کر رہے تھے تو ہم نے بن مانسوں کے ہنسنے کی آوازیں سنیں۔ وہ ہمارے میدان چھوڑ کر بھاگ جانے کی خوشی منا رہے تھے ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن ہرے ہرے پتوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ بہر حال انھوں نے ہمارا پیچھا نہیں کیا اور جلد ہی ہم ایک ایسے علاقے میں آ گئے جہاں صرف جھاڑیاں تھیں اور اب بن مانسوں کے اچانک حملے کا خطرہ نہیں رہا تھا۔

شام سے ذرا پہلے ہم جھیل تک پہنچ گئے۔ ہمارے جنگلی ساتھیوں نے جھیل کی طرف دیکھ کر خوشی کا نعرہ مارا۔ ہم نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا ایک بیڑا کنارے کی طرف آ رہا ہے۔ ابھی کشتیاں کئی میل دور تھیں لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ قریب آ گئیں۔ یہ جنگلی بڑے ماہر ملاح تھے۔ کشتی والوں نے جب نوجوان سردار کو زندہ سلامت دیکھا تو خوشی کے نعرے لگانے لگے۔ جلد جلد کنارے پر پہنچ کر وہ

کشتیوں سے کود پڑے اور نوجوان سردار کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر اوندھے لیٹ گئے۔

اُن میں ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس نے گلے میں کانچ کے موتیوں کا ہار پہن رکھا تھا اور جس کے ہاتھوں میں بھی ویسے ہی کڑے تھے۔ اُس کے جسم پر کسی خوب صورت جانور کی کھال کا لبادہ تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر نوجوان سردار کو گلے سے لگا لیا۔ پھر ہمارے بارے میں سوالات کیے۔ نوجوان نے اُن کے جواب دیے۔ اس کے بعد وہ بوڑھا بڑے وقار سے آگے بڑھا اور باری باری اُس نے ہم سب کو گلے لگایا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ بوڑھا 'اکالا' قوم کا بادشاہ ہے اور ہم نے ولی عہد کی جان بچا کر پوری قوم پر احسان کیا ہے۔ اُن کی زبان میں ولی عہد کو 'مارٹیاس' کہا جاتا تھا۔

یہ جنگلی جنگ کے لیے تیار ہو کر آئے تھے اور غالباً اپنے ولی عہد کو اُٹھالے جانے کے جرم میں بن مانسوں کے خلاف اعلان جنگ کرنے والے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بانس کے بنے ہوئے تیز برچھے تھے، کندھوں پر کمانیں لٹک رہی تھیں اور تیروں سے بھرے ہوئے ترکش سب کے پاس تھے۔ ان کی گفتگو میں بار بار لفظ 'ڈوڈا' آ رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈوڈا یعنی بن مانسوں کی قوم کو سزا دینے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

اُسی وقت بادشاہ کی صدارت میں جنگی کونسل کا اجلاس ہوا۔

جس میں کئی آدمیوں نے جوشیلی تقریریں کیں۔ سب سے جوشیلی تقریر ہمارے نوجوان دوست ولی عہد نے کی جس میں بار بار ہمارا حوالہ دیا گیا۔ شاید وہ کہہ رہا تھا کہ ایک آخری جنگ لڑ کر بن مانسوں کو ختم کر دیا جائے۔ ہمارے یہ دوست جن کے پاس جادو کے زبردست ہتھیار ہیں ہماری مدد کریں گے اور اُن کی مدد سے ہم یہ لڑائی جیت لیں گے۔

تقریر ختم ہونے پر جنگ جو جوانوں نے اپنے برچھے ہلا ہلا کر نعرے لگائے۔ وہ سب جوش میں بھرے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اُن کے بادشاہ نے ہمارے پاس آ کر جنگل کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔

لارڈ جان نے ہم سے کہا۔

"ان بن مانسوں نے ہمیں بھی کچھ کم نہیں ستایا ہے۔ بہتر ہے اس جنگ میں ہم اکالا قوم کا ساتھ دیں اور ڈوڈا قوم سے انھیں مکمل چھٹکارا دلا دیں۔ یہ انسانیت پر بڑا احسان ہو گا۔"

تھوڑی سی بحث کے بعد ہم اس پر تیار ہو گئے۔ یہ رائے اس لیے بھی ٹھیک تھی کہ بن مانسوں سے خود ہمیں بھی مستقل خطرہ تھا۔ بات طے ہو جانے کے بعد لارڈ جان نے اکالا قوم کے بادشاہ کو اشاروں سے بتایا کہ ہم تیار ہیں۔ اس پر سارے جنگلیوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔

اب رات ہو چلی تھی۔ جنگلیوں نے جگہ جگہ الاؤ جلا لیے تھے۔

اس کے بعد کچھ لوگ ایک سبزی خور ڈینوسار کو ہنکاتے ہوئے لائے۔ اس کے شانے پر راکھ کے رنگ کا گول سا نشان بنا تھا۔ اب ہمیں پتا چلا کہ یہ جانور ان کے پالتو مویشی ہیں جن کا گوشت ان کی خوراک ہے۔ جس طرح ہم اپنی بھیڑوں اور دوسرے مویشیوں پر شناخت کے لیے نشان لگا دیتے ہیں اسی طرح ان کے ہاں بھی یہ دستور ہے۔

یہ جانور بڑا بے ضرر تھا۔ بڑی آسانی سے اسے ذبح کر ڈالا گیا اور اس کا گوشت تکا بوٹی کر کے آگ پر بھونا جانے لگا۔ کچھ آدمیوں نے اپنے برچھے بھونک کر جھیل سے مچھلیاں بھی پکڑ لی تھیں انھیں بھی بھونا جا رہا تھا۔ جب تک کھانا تیار ہوتا رہا ہم ادھر ادھر گھومتے رہے۔ ہمیں وہ چھوٹا سا چشمہ بھی ملا جس سے گیس نکل رہی تھی۔ چیلنجر نے ایک نرکل توڑ کر اس میں گیس بھری اور پھر ماچس سے اسے جلایا۔ گیس بھک سے اڑ گئی۔ اس کے بعد چیلنجر نے جیب سے نیلے چمڑے کی ایک تھیلی نکالی۔ اس میں گیس بھر کر اس کا منہ باندھ کر چھوڑ دیا تو وہ اڑتی چلی گئی۔

اس کے بعد ہم واپس آ گئے۔ اتنے آدمیوں کو ایک جگہ اکٹھا دیکھ کر کس جانور کی ہمت تھی کہ قریب آتا۔ صرف چند ٹیروڈیکٹائل اپنے بڑے بڑے پر پھیلائے آسمان پر چکر لگا رہے تھے۔ لیکن جھیل کی سطح پر بڑا ہنگامہ تھا۔ طرح طرح کے پانی کے جانور اچھل

رہے تھے۔ اس کے اندر نیلے تالابوں پر بڑے بڑے کچھوے اور دوسرے جانور پڑے ہوئے تھے۔ ایک جانور بڑا عجیب تھا۔ بالکل یہ معلوم ہوتا تھا کہ سیاہ چمڑے کا بڑا سا گدا ہے جو آہستہ آہستہ پانی کی طرف کھسک رہا ہے۔ پانی میں بڑے بڑے سانپ بھی تھے جو بار بار اپنا بھیانک منہ اوپر نکال کر ادھر ادھر دیکھتے اور پھر ڈبکی مار جاتے۔ ان میں سے ایک سانپ خشکی پر چڑھ آیا۔ سانپ کیا تھا اچھا خاصا اژدہا تھا۔ اس کا جسم ایک بڑے پیپے کی طرح تھا جس کے دو بڑے بازو تھے جو چوڑے پتواروں کی طرح تھے۔ اس پیپے میں سانپ کی سی لمبی گردن تھی اور دوسرے سرے پر ایک بھیانک سر تھا جس پر دو سینگ بھی تھے۔

چیلنجر اور سمرلی اسے دیکھ کر پھڑک اٹھے۔ چیلنجر نے کہا "آہا! لیبی سارس۔ میٹھے پانی کا لیبی سارس ــ کون سمجھ سکتا تھا کہ اس زمانے کا کوئی انسان ایک زندہ لیبی سارس دیکھ سکے گا۔"

دونوں سائنس دان نہ جانے کب تک لیبی سارس پر بحث کرتے رہے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کھانے کا بلاوا آ گیا۔ ہم لوگوں نے نہایت لذیذ کھانا کھایا جس میں مزے دار پھل اور کسی جانور کا دودھ بھی تھا جو لکڑی کے پیالوں میں تقسیم کیا گیا۔ ہم چاروں کو ولی عہد کے ساتھ بٹھایا گیا۔

صبح ہم سو کر اٹھے تو معلوم ہوا کہ رات کو غاروں سے تازہ کمک

آگئی تھی اور اب فوج کی تعداد پانچ سو کے لگ بھگ ہو گی۔

بادشاہ کے حکم پر روانگی شروع ہوئی۔ جب بن مانسوں کی بستی قریب آگئی تو سب لوگوں نے ایک بڑا سا گھیرا بنا لیا۔ آگے برچھی والے تھے اور ان کے پیچھے تیر کمان والے۔ بادشاہ اور ولی عہد درمیان میں تھے۔ لارڈ جان اور سمرلی دائیں طرف ہو گئے اور میں اور چیلنجر بائیں جانب۔

اچانک بن مانسوں کی بستی میں شور اٹھا اور ان کی ایک ٹولی جو ڈنڈوں اور پتھروں سے لیس تھی ہماری فوج کے درمیانی حصے پر حملہ آور ہوئی۔ بن مانسوں کی رفتار تیز نہ تھی اور جنگلی بلا کے پھرتیلے تھے۔ انھوں نے بن مانسوں کو تیروں سے چھید ڈالا۔ ایک زخمی بن مانس چیختا ہوا میرے قریب سے بھاگا۔ مجھ سے اس کی تکلیف نہیں دیکھی گئی۔ میں نے گولی مار کر اسے تکلیف سے چھٹکارا دلا دیا۔ اس پہلے حملے میں بس یہی ایک گولی چلائی گئی۔ ہم لوگوں کے لڑائی میں حصہ لینے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔

اس لڑائی سے فارغ ہو کر ہم آگے بڑھے۔ اب ہم درختوں تلے پہنچ گئے تھے۔ یہاں صورتِ حال دوسری تھی۔ بن مانس اپنے ڈنڈے لے لے کر اوپر سے کودتے اور پیشتر اس کے کہ کوئی ان کے برچھا بھونکتا وہ دو تین جنگلیوں کا صفایا کر ڈالتے۔ ایک بن مانس کا ڈنڈا سمرلی کی بندوق پر پڑا جس سے اس کے پرخچے اڑ گئے۔

دوسرا ڈنڈا خود سمرلی کے پڑنے والا تھا کہ ایک جنگلی نے بن مانس کے برچھا بھونک دیا۔

بہت سے بن مانس درختوں پر سے پتھراؤ کر رہے تھے اگر ہماری بندوقیں نہ ہوتیں تو جنگلیوں کی شکست یقینی تھی۔ لیکن ہم نے بہت جلد حالات پر قابو پا لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بن مانسوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ چیختے چلاتے بھاگنے لگے۔ فتح مند جنگلیوں نے ان کا پیچھا کیا اور اپنے تیروں سے انھیں چھیدنا شروع کر دیا۔ اب لارڈ جان اور سمرلی بھی، جو دوسرے سرے پر تھے ہمارے پاس آگئے تھے۔

لارڈ جان نے کہا۔ "چلو قصہ پاک ہوا۔"

ہم بن مانسوں کی بستی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ راستے میں بن مانسوں کی لاشیں ملیں جن کے بدن تیروں اور برچھوں سے چھدے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں کسی بدنصیب جنگلی کی لاش بھی پڑی ملی۔ بستی کے پاس پہنچ کر بن مانسوں نے آخری مقابلہ کیا لیکن اس میں بھی انھیں شکست ہوئی۔ آخر میں کوئی اسی نر باقی رہ گئے تھے۔ جنگلیوں نے ایک گھیرا بنایا اور انھیں کنارے تک لے گئے وہاں سے اسی طرح انھیں نیچے کودنے پر مجبور کیا جس طرح وہ انسانوں کو کیا کرتے تھے۔ غرض اس طرح انسانوں اور بن مانسوں کی جنگ، جو یہاں صدیوں سے چل رہی تھی، ختم ہو گئی۔ بن مانسوں کی مادائوں

اور بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔ اور پھر فتح کا جشن شروع ہوا۔

اب ہم اطمینان سے اپنے کیمپ پر پہنچے اور اپنا بچا ہوا سامان سمیٹا۔ زمبو سے بھی باتیں ہوئیں۔ اُس نے کہا۔

"واپس آجائیے جناب۔ وہاں شیطان کی حکومت ہے۔ وہ آپ کو مار ڈالے گا۔"

سمرلی نے کہا۔ "زمبو ٹھیک کہتا ہے۔ اب ہمیں واپس جانا ہی چاہیے۔"

اور پھر ہم نے جیلنجر کو مجبور کیا کہ وہ واپسی کا طریقہ سوچے۔ یہاں تک کے واقعات میں زمبو کے پاس پہنچا رہا ہوں تاکہ اگر ہم واپس نہ آسکیں تو یہ تحریر ہی دُنیا تک پہنچ جائے۔

خُفیہ راستہ

اِس جنگ کے بعد ہمارے ٹھاٹھ ہی کچھ اور ہو گئے۔ سارے جنگلی ہمارے جادُو کے ہتھیاروں کے ڈر سے اور ہمارے اِحسان کی وجہ سے ہمارا اِحترام کرنے لگے لیکن ہمیں یہاں رہنا تو تھا نہیں۔ ہمیں یہ معلوم تھا کہ کسی زمانے میں نیچے سے اوپر تک ایک سُرنگ آتی تھی۔ اِسی راستے سے بن مانس اور یہ جنگلی یہاں پہنچے ہوں گے اور میپل وہائیٹ نے بھی آنے اور جانے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا تھا لیکن بعد میں وہ سُرنگ بند ہو گئی تھی۔ جنگلیوں نے اِشاروں سے ہمیں بتایا کہ ایک بہت زبردست زلزلہ آیا تھا جس سے یہ سُرنگ بند ہو گئی۔

جو بن مانس غُلام بنائے گئے تھے اُن سے پانی بھروانے اور لکڑیاں اکٹھی کرانے کا کام لیا جاتا تھا اور اُنھیں باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ جنگلیوں نے ہمیں بھی اپنے غاروں میں رہنے کی پیشکش کی لیکن ہم نے غاروں والی پہاڑیوں کے دامن میں زمین

پر ہی اپنا کیمپ بنانا پسند کیا۔

یہ غار خُدا جانے قدرتی تھے یا ان جنگلیوں کی پچھلی نسلوں نے بنائے تھے بہرحال اُن کی ساخت عجیب قسم کی تھی۔ پہاڑی چٹانوں کے ایک طرف پتلی ڈھلوان سیڑھیاں اُوپر جاتی تھیں۔ کوئی اسّی فٹ کی بلندی پر ایک قطار میں سارے غار تھے اور غاروں کے سامنے چند فٹ چوڑا پلیٹ فارم تھا۔ کوئی خطرناک جانور اس پتلے زینے پر چڑھ کر وہاں نہ پہنچ سکتا تھا۔ ہم نے کُچھ غاروں میں جا کر دیکھا۔ یہ اندر سے کشادہ اور خُشک تھے۔ دیواریں ہموار تھیں اور اُن پر کوئلے سے جانوروں وغیرہ کی تصویریں بنی تھیں۔

ہم سمجھتے تھے کہ بن مانسوں کے خاتمے کے بعد اب اکالا قوم اس سارے علاقے کی مالک ہے اور اب اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے لیکن ہمارا خیال غلط نکلا۔ کیونکہ ہمارے وہاں پہنچنے کے تیسرے دن ایک خوفناک واقع ہُوا۔ اُس روز کچھ جنگلی پانی کی چھپکلیوں کا شکار کرنے جھیل پر گئے ہُوئے تھے۔ چلینجر اور سمرلی ان دیوزاد چھپکلیوں کی عادتوں وغیرہ کی تحقیق کرنے اُن کے ساتھ گئے تھے۔ میں اور لارڈ جان کیمپ ہی میں تھے۔ کچھ جنگلی سامنے گھاس کے بڑے میدان میں اِدھر اُدھر مختلف کاموں میں مصروف تھے کہ اچانک جنگلیوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ سب کی زبان پر ایک ہی لفظ تھا۔ "اسٹوآ" اور پھر مرد، عورتیں اور بچے دیوانہ وار سیڑھیوں کی طرف بھاگے

اور گرتے پڑتے اُوپر چڑھنے لگے۔ ہم نے مُڑ کر دیکھا تو وہ ہاتھ ہلا ہلا کر اور چیخ چیخ کر ہمیں بھی اُوپر بُلا رہے تھے۔ ہم نے اپنی بندوقیں اور کارتوس سنبھالے اور اُوپر جانے کے بجائے آگے بڑھے کہ دیکھیں معاملہ کیا ہے؟

ابھی ہم گھاس کے میدان کے بیچ میں پہنچے ہی تھے کہ جنگل سے کوئی پندرہ سولہ جنگلی بے تحاشا بھاگتے ہُوئے نکلے۔ اُن کے پیچھے دو ویسے ہی دیوزاد مینڈک تھے جن میں سے ایک نے ہمارے کیمپ پر حملہ کیا تھا اور ایک میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ ان کی شکل اور جسم بالکل مینڈک جیسا تھا لیکن ڈیل ڈول ہاتھی سے بھی بڑا۔

اس سے پہلے میں نے ان مینڈکوں کو اندھیرے میں دیکھا تھا۔ اب دن کی روشنی میں دیکھا کہ ان کی چمک دار کھال پر قوسِ قزح جیسے رنگ اور دھبے تھے اور دُھوپ میں وہ چمک رہی تھی۔ وہ کُود کُود کر چلتے تھے مگر رفتار خاصی تیز تھی۔ جلد ہی جنگلیوں کو انھوں نے جا لیا۔ وہ کُود کر اپنے شکار پر جا گرتے۔ وہ بے چارہ کُچل کر فوراً ہلاک ہو جاتا۔ یہ اُسے نگل کر فوراً اگلے شکار پر جھپٹتے۔

بے چارے جنگلی جان کے خوف سے اِدھر سے اُدھر بھاگ رہے تھے لیکن بچنا مُحال تھا۔ اب پانچ چھ ہی جنگلی زندہ بچے تھے میں نے اور لارڈ جان نے ان دیوزاد مینڈکوں پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اُن پر کوئی اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ دراصل اُن کا جسم بڑی

قدیم ساخت کا تھا یعنی جسم کا ہر ہر خلیہ اپنی جگہ جان دار تھا اور جسم کے ایک حصّے کا دُوسرے سے اِس کے سوا کوئی تعلّق نہ تھا کہ پُورے جسم پر ایک ہی کھال منڈھی ہُوئی تھی۔

ہمارے گولی چلانے سے اِتنا فائدہ ضرور ہُوا کہ اُن کی رفتار کم ہوگئی اور توجہ ہماری طرف بٹ گئی۔ اِس سے اُن پانچ چھ جنگلیوں کو بھاگ کر زینے تک پہنچ جانے کا موقع مل گیا۔ ہم بھی زینے پر پہنچ گئے۔

جہاں ہماری بیسویں صدی کی بندوقیں کام نہیں آئیں وہاں جنگلیوں کے تیروں نے کام کر دکھایا۔ مگر زہر میں بجھے ہُوئے اِن تیروں کا اثر دیر میں ہوتا تھا۔ دونوں مینڈک اُچھل اُچھل کر اُوپر چڑھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اُن کے بدن چھوٹے چھوٹے تیروں سے چھد گئے تھے لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن پر کوئی اثر نہیں ہُوا مگر تھوڑی دیر بعد ایک کے گلے سے عجیب سے غرّاہٹ کی آواز نکلی پھر اُس نے اپنا سر زمین پر ٹپک دیا۔ اس کے بعد دُوسرے نے بھی تڑپنا اور لوٹنا شروع کیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں ٹھنڈے ہو گئے۔ جنگلیوں نے فتح کا نعرہ لگایا اور وہ نیچے اُتر کر اپنے دُشمنوں کی لاشوں کے گرد ناچنے لگے۔ رات کو اُنھوں نے لاشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کیے اور اُٹھا کر دُور جنگل میں پھینک آئے۔ یہ گوشت زہریلا ہو چکا تھا اس لیے کھایا نہ جا سکتا تھا۔

یہ حالات میں گوشت کے ٹین پر کاغذ رکھ کر لکھ رہا ہُوں۔ کبھی سکون کے ساتھ لکھنے کا موقع مِلا تو اکالا قبیلے کے بارے میں تفصیل سے لکھوں گا اور میپل وہائیٹ لینڈ کے بارے میں بھی بتاؤں گا کہ گلیڈی جھیل کے پانی کی سطح چاندنی رات میں کس طرح چمکتی ہے۔

اس جھیل میں ایسے ایسے جانور ہیں کہ بعض کا تو ہمیں نام بھی نہیں معلوم۔ مثال کے طور پر ایک مچھلی ہے جو آدھی بیل کی طرح اور آدھی عام مچھلیوں کی طرح ہے۔ اس کی دونوں آنکھوں کے گرد مضبوط ہڈی کے حلقے ہیں اور پیشانی پر ایک تیسری آنکھ بھی موجود ہے۔ یہ مچھلی ایک بار جال میں پھنس گئی تو ہماری کشتی اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ اُسی رات سبز رنگ کا ایک سانپ پانی سے برآمد ہُوا اور چیلنجر کی کشتی کے ملّاح کو اپنی لپیٹ میں لے کر پانی میں غائب ہو گیا۔ عام طور سے یہ سانپ جھیل کے کنارے دلدل میں رہتا ہے اور جنگلی باشندے اس دلدل کے قریب جاتے ہُوئے ڈرتے ہیں۔

اس سانپ کا پیٹ گائے سے زیادہ موٹا ہے اور اُس میں سے مُشک کی سی تیز خوش بُو نکلتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک بہت بڑے پرندے نے جو ٹیروڈکٹائل سے مختلف تھا، چیلنجر کا پیچھا کیا اور اگر وہ چٹانوں میں نہ چھپ جاتے تو ان کی خیریت نہیں تھی۔ یہ پرندہ شتر مرغ سے اُونچا تھا اور اُس کی چونچ چیل کی طرح تیز نوکیلی اور مُڑی ہُوئی تھی۔ بھاگتے بھاگتے اُس نے چیلنجر کے جُوتے کی ایڑی اپنی چونچ

سے اس صفائی سے کُتر لی جیسے بسولے سے الگ کی گئی ہو۔ اِسی طرح ایک بار ہم نے دس فُٹ لمبا سُور مارا جو جھیل کے کنارے پانی پی رہا تھا۔

یہ ساری باتیں میں پھر کبھی تفصیل سے لکھوں گا اور بتاؤں گا کہ وہاں ہر موسم کا حُسن کس طرح بکھر جاتا ہے۔ بہار میں جنگل کے جنگل پُھولوں سے ڈھک جاتے ہیں اور سارے علاقے میں خُوشبو ہی خُوشبو پھیل جاتی ہے، وہاں پھل اِتنے لذیذ ہوتے ہیں کہ دُنیا کے اچھّے سے اچھے پھل ان کے سامنے بے مزہ معلُوم ہوں۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ یہ لوگ واپسی کے مسئلے پر غور کرنے کے بجائے سیر و تفریح میں مصرُوف ہو گئے لیکن یہ بات نہیں بلکہ ہم میں سے ہر ایک واپسی کے مسئلے پر پُوری توجّہ دے رہا تھا لیکن کامیابی نہ ہو رہی تھی۔

ایک اور بات جو ہمیں معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ جنگلی لوگ اس سلسلے میں ہماری مدد کرنے کو تیار نہ تھے۔ شاید اُن کے ہاں یہ کوئی سخت قسم کا مذہبی حُکم تھا کہ نہ خُود باہر جاؤ نہ کسی کو باہر جانے کا راستہ بتاؤ۔ ویسے وہ ہمارے دوست تھے بلکہ اُنھیں بے دام غُلام کہنا غلط نہ ہو گا۔ لیکن جب ہم اُن سے کہتے کہ ہمیں چمڑے کے اِتنے لمبے لمبے رسّے بنا دو جن کے سہارے ہم اُتر جائیں تو وہ صاف انکار کر دیتے۔ خُود بادشاہ کا بھی یہی رویّہ تھا۔ البتّہ ولی عہد کو، جس کی

جان ہم نے بچائی تھی، ہم سے ہمدردی تھی اور وہ اِشاروں سے اس کا اِظہار بھی کرتا تھا۔

جنگلیوں نے ہم سب کو ایک ایک غار دینے کی پیش کش بھی کی لیکن ہم مُہذّب دُنیا کو چھوڑ کر یہاں آباد ہو جانے پر کس طرح تیار ہو جاتے۔ ان لوگوں کے یہ اِرادے دیکھ کر ہم نے طے کر لیا کہ یہاں سے اپنی روانگی کے منصُوبوں کو راز میں رکھیں گے ورنہ اگر اُنھیں علم ہو گیا تو وہ ہمارے منصُوبوں کو ناکام بنانے کے لیے سب کچھ کر گزریں گے

جانوروں کے خطرے کے باوجُود میں اس دوران میں دو مرتبہ پُرانے کیمپ گیا اور زمبُو سے باتیں کیں۔ زمبُو ہر بار مجھے یقین دلاتا کہ وہیں اب وہ مقامی باشندے رسیّاں وغیرہ لے کر ایک دو دِن میں پُہنچنے ہی والے ہیں۔"

جب دُوسری مرتبہ میں کیمپ سے واپس لوٹ رہا تھا تو ٹمبرووڈ کناٹمل کو کے غار کے پاس میں نے ایک بڑا سا پنجرا دیکھا جو زمین پر گھسٹتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہُوئی جب قریب جا کر دیکھا تو اُس کے اندر لارڈ جان تھے۔

"خیریت تو ہے؟" میں نے پُوچھا۔

"ذرا اپنے ٹمبرووڈ کناٹمل دوستوں سے ملنے جا رہا تھا۔" اُنھوں نے جواب دیا۔

"لیکن پنجرے میں کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"یہ دیوزاد پرندے بڑے بداخلاق ہیں۔ مہمانوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ پنجرہ اُن کی چونچوں سے محفوظ رکھتا ہے۔"

"لیکن ایسی دوستی کی ضرورت ہی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

جواب میں لارڈ جان نے بتایا۔ "دراصل پروفیسر چیلنجر ضد کر رہے ہیں کہ میں اُن کے لیے ٹیروڈیکٹائل کا ایک بچہ پکڑ دوں۔ اُنہی کی خاطر یہ سوانگ رچانا پڑا ہے۔"

سمرلی چیلنجر کو بُرا بھلا کہا کرتے کہ وہ یہاں سے نکلنے کی ترکیب نہیں سوچ رہے ہیں۔ اس سے جو وقت ملتا وہ کیڑوں مکوڑوں کے نمونے جمع کرنے اور انھیں صاف اور خشک کر کے تھیلے میں بھرنے پر صرف کرتے۔

چیلنجر روز صبح کو کہیں چلے جاتے اور دوپہر یا تیسرے پہر کو واپس آتے تو اُن کے چہرے پر ایسی سنجیدگی ہوتی جیسی بھاری ذمہ داریوں سے نمٹنے والوں کے چہروں پر ہوتی ہے اور پھر ایک دن وہ ہمیں بھی اپنی خفیہ لیبارٹری میں لے گئے۔

یہ لیبارٹری اُنھوں نے پام کے درختوں کے ایک جھنڈ کے درمیان بنا رکھی تھی۔ اس جھنڈ میں اُبلتے ہوئے پانی اور دلدل کا وہ چشمہ تھا جس میں سے گیس نکلتی تھی۔ اُس کے کنارے ڈینوسار کی کھال سے کاٹ کر بنائی ہوئی بہت سی پٹیاں پڑی تھیں۔ وہیں ایک دیوزاد چھپکلی کے معدے کی اندرونی جھلی بھی تھی جسے بڑی صفائی

سے اُتار کر خشک کر لیا گیا تھا۔ پروفیسر نے مضبوط کانٹوں کی مدد سے اسے سی کر بند کر لیا تھا اور صرف تھوڑا سا حصہ کھلا رکھا تھا۔ اس کھلے حصے میں اُنھوں نے کئی پتلے پتلے نرکل ٹھونس رکھے تھے۔ نرکلوں کے دُوسرے سرے اُس دلدل میں گاڑ دیے تھے جس سے بُلبلوں کی شکل میں گیس خارج ہو رہی تھی۔ آہستہ آہستہ گیس اس غبارے میں بھرنے لگی۔ پروفیسر چیلنجر نے چمڑے کی پٹیوں سے اس غبارے کو چاروں طرف پام کے درختوں کی جڑوں سے باندھ دیا۔

کوئی آدھ گھنٹے میں اُس میں اتنی گیس بھر گئی کہ غبارہ اُوپر اُٹھنے کے لیے زور لگانے لگا۔ چیلنجر فخر سے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ ہم سب خاموش تھے۔ آخر سمرلی نے کہا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم اس میں لٹک کر یہاں سے نکل سکتے ہیں؟"

چیلنجر نے جواب دیا۔ "میں تم پر یہی ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ غبارہ اتنا طاقتور ہے کہ ہم سب کا بوجھ سہار سکتا ہے۔"

"کیا تم ہمیں پاگل سمجھتے ہو؟" سمرلی نے غصے میں کہا۔

"میں اپنی جان اس طرح جوکھوں میں ہرگز نہ ڈالوں گا۔"

دونوں میں پھر ٹھن گئی لیکن حسبِ معمول لارڈ جان نے یہ کہہ کر بیچ بچاؤ کرایا کہ بھئی دیکھیں تو، یہ غبارہ اُڑتا کیسے ہے؟" یہ کہہ کر اُنھوں نے میرے کان میں آہستہ سے کہا۔ "یار یہ پروفیسر ہے بلا کا ذہین۔"

میں نے پروفیسر چیلنجر سے کہا "غبارہ تو آپ نے بنا لیا لیکن ہم بیٹھیں گے کہاں؟"

چیلنجر نے جواب دیا۔ "اصل مشکل غبارے کی تھی وہ تو میں نے بنا لیا۔ بید کا کھٹولا بنا لینا کیا مشکل ہے لیکن پہلے میں مسٹر سمرلی کو، جنھیں اپنی جان بہت پیاری ہے یہ دکھا دوں کہ میرا غبارہ کتنا بوجھ سہار سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر چیلنجر ایک پتھر اٹھا لائے جو اتنا بڑا تھا کہ اُن کے سوا ہم میں سے کوئی بھی اُسے نہ اُٹھا سکتا تھا۔ اُنھوں نے پہلے سے چمڑے کی پٹیوں کا ایک جال بنا رکھا تھا۔ یہ جال اُنھوں نے غبارے کے اُوپر رکھا اور اُن پٹیوں کے دُوسرے سرے نیچے لا کر ڈیڑھ سو فٹ لمبی رسّی جو ہمارے پاس تھی اس میں مضبوطی سے باندھ دی۔ اِس رسّی کے درمیانی حصّے سے اُنھوں نے پتھر کو اچھی طرح کس دیا اور رسّی کا آخری سرا اپنی کلائی میں کئی بل دے کر لپیٹ لیا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب میں دِکھاؤں کہ میرے غبارے میں کتنی طاقت ہے؟"

یہ کہہ کر اُنھوں نے جلد جلد چمڑے کی وہ پٹیاں چاقو سے کاٹ دیں جن سے یہ غبارہ پام کے درختوں کی جڑوں سے بندھا ہُوا تھا۔ پھر جو ہُوا اُس کی ہمیں تو کیا خود چیلنجر کو بھی توقّع نہ تھی۔ غبارہ تیزی سے اُوپر اُٹھا اور جب غبارے اور پتھر کے درمیان کی رسّی تن گئی تو ایک

لہٰذا وہ ٹھہرا اور پھر پتھر بھی زمین سے اُٹھتا چلا گیا۔ چیلنجر نے اپنے دونوں پیر زمین میں اچھی طرح گاڑ دیے تاکہ اپنی کلائی کے زور سے اسے روکے رہیں لیکن ایک ہی جھٹکے میں اُن کے پیر اکھڑ گئے اور وہ بھی ہوا میں ڈولنے لگے۔

میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ مسٹر چیلنجر کی کمر کے گرد ڈال کر اُنھیں پکڑ لیا مگر میں بھی ہوا میں بلند ہو گیا۔ لارڈ جان نے میرے پیر پکڑ لیے مگر غبارے نے اُنھیں بھی زمین سے اُٹھا لیا۔ میں تو ڈر گیا کہ خدا جانے ہم اسی طرح ایک دُوسرے کے سہارے لٹکے ہُوئے کہاں تک جائیں گے مگر خوش قسمتی سمجھیے کہ رسّی ٹوٹ گئی۔ اُس کے ٹوٹتے ہی ہم لوگ گر پڑے اور غبارہ تیزی سے اُڑتا ہُوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ وزنی پتھر اب تک اس میں لٹک رہا تھا۔

"دیکھا آپ نے؟" چیلنجر نے فخر سے کہا۔ اس کے بعد بولے۔ "آپ لوگ مطمئن رہیں۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر دُوسرا غبارہ مع کھٹولے کے بناؤں گا اور ہم لوگ بڑے آرام اور حفاظت کے ساتھ اس میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائیں گے۔"

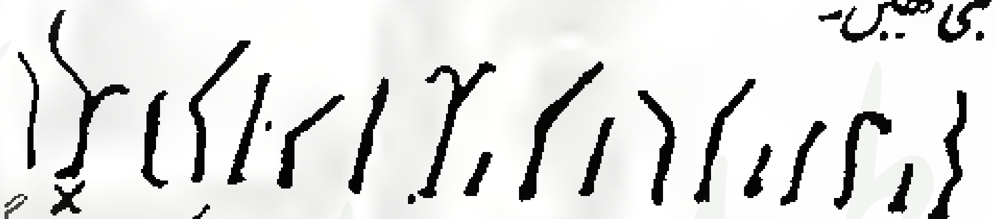
سمرلی یہ سُن کر کچھ بولے تو نہیں لیکن ان کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس سفر کو خطرناک سمجھتے ہیں۔

لیکن ہمیں اس خطرے میں پڑنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہُوں کہ وہاں صرف ایک ہستی ایسی تھی

جسے ہم سے ہمدردی تھی اور یہ ہستی نوجوان ولی عہد کی تھی جس کی جان ہم نے بچائی تھی۔

جس روز چیلنجر نے غبارے کا تجربہ کر کے دکھایا تھا اسی شام مغرب کے وقت ولی عہد میرے پاس آیا۔ ہم چاروں میں وہ مجھ سے ہی زیادہ مانوس ہو گیا تھا اس لیے کہ میں تقریباً اس کا ہم عمر تھا۔ یہاں تو اس نے کسی درخت کی چھال کا ایک ٹکڑا جو لپٹا ہوا تھا، مجھے دیا۔ اس کے بعد اس نے غاروں کی ایک قطار کی طرف اشارہ کیا اور پھر انگلی ہونٹوں پر رکھ کر بتایا کہ یہ بڑے راز کی بات ہے۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔

میں چھال کے اس ٹکڑے کو اپنے ساتھیوں کے پاس لایا اور ہم سب نے الاؤ کی روشنی میں اسے کھول کر دیکھا۔ یہ ٹکڑا کوئی ایک فٹ مربع تھا اور اس کے درمیان کوئلے سے اس قسم کی لکیریں بنی تھیں۔



پہلی نظر میں تو میں یہ سمجھا کہ شاید یہ کوئی تعویذ ہے لیکن جس سنجیدگی کے ساتھ اس نے مجھے یہ لاکر دیا تھا اسے دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ یہ کوئی بڑی اہم چیز ہے۔

"اس نے شاید مذاق کیا ہے۔"

"یہ سمرلی کی رائے تھی لیکن چیلنجر کہتے تھے کہ یہ کوئی رسم الخط ہے جس میں کوئی عبارت لکھی ہے۔

"ذرا مجھے دکھانا۔" یہ کہہ کر لارڈ جان نے چھال کا وہ ٹکڑا لے لیا۔ کچھ دیر تک وہ اسے دیکھتے رہے پھر یکایک ان کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر بولے۔

"دیکھو، یہ کل اٹھارہ لکیریں ہیں اور اس پہاڑی کے اوپر غاروں کی تعداد بھی اٹھارہ ہے۔ یقیناً یہ اس جگہ کا نقشہ ہے۔"

اب تو سب لوگ نقشے کو غور سے دیکھنے لگے۔ "چیلنجر نے کہا بائیں طرف سے دوسرے غار پر جو کراس کا نشان ضرور کوئی معنی رکھتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ غار چٹان کے آر پار ہے۔" میں نے کہا جس پر چیلنجر نے مجھے شاباش دی اور کہا۔ اگر یہ غار ان پہاڑیوں کے آر پار ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ دوسری طرف یہ زمین سے کوئی سو فٹ بلند ہو گا۔"

"پھر تو ہم اتر چکے۔" سمرلی نے برا سا منہ بنا کر کہا لیکن میں نے انھیں خوش خبری سنائی۔ میں نے کہا۔ "ہمارے پاس سو فٹ سے زیادہ لمبی ایک رسی موجود ہے۔"

"اگر ان غاروں میں جنگلی ہوئے تو؟" سمرلی نے ایک اور خدشہ ظاہر کیا لیکن میں اس سے پہلے یہ غار سرسری طور پر دیکھ چکا تھا۔ اس لیے میں نے بتایا۔ "یہ اٹھارہ کے اٹھارہ غار غیر آباد ہیں۔"

آخر طے یہ پایا کہ اپنا سامان یہیں چھوڑ کر پہلے ہم جا کر غار کا جائزہ لیں۔ اس جنگل میں ایک خشک لکڑی ہوتی تھی جس میں شاید تیل کا کوئی جزو تھا اور یہ خوب جلتی تھی۔ جنگلی اُس کی مشعلیں استعمال کرتے تھے۔ ہم نے بھی اُس لکڑی کے کچھ ٹکڑے اکٹھے کیے اور اس غار کے اندر داخل ہو گئے۔ ہمارے اندر پہنچتے ہی بڑی بڑی چمگادڑیں جو غار کی چھت میں لٹکی ہوئی تھیں شور کرتی ہوئی باہر کی طرف لپکیں۔

ہمیں ڈر تھا کہ جنگلیوں کو روشنی دیکھ کر شبہ نہ ہو جائے اس لیے غار کے اندر کافی دُور ہم اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر بڑھے اور جب ہم دو تین موڑ مڑ گئے اور یہ اطمینان ہو گیا کہ اب روشنی باہر نہیں جائے گی تب ہم نے مشعلیں جلالیں۔ یہ بالکل خشک سُرنگ تھی۔ دیواریں ہموار تھیں اور ان پر جنگلیوں کی بنائی ہوئی تصویریں تھیں۔ فرش پر سفید چمک دار ریت بچھی ہوئی تھی۔ ہم آگے بڑھتے چلے گئے لیکن آگے جا کر یہ راستہ بند ہو گیا۔

ہمارے دل بجھ گئے اور ہم بڑی دیر چُپ چاپ کھڑے رہے راستہ پتھروں یا مٹی کے ڈھیر سے بند نہیں ہوا تھا بلکہ ایک باقاعدہ دیوار سامنے آگئی تھی جو اس کا ثبوت تھا کہ ہمیشہ سے یہ اسی طرح ہے۔

چیلنجر نے سینہ ٹھونک کر کہا "فکر مت کرو دوستو، میں اب بھی

غبارہ بنانے کا ذمہ لیتا ہوں۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمھارا غبارہ" سمرلی نے دانت پیس کر کہا

"کہیں ہم غلط غار میں تو نہیں چلے آئے؟" میں نے خیال ظاہر کیا لیکن لارڈ جان نقشہ ساتھ لائے تھے۔ انھوں نے اُسے دکھاتے ہوئے کہا۔

"اپنے آپ کو دھوکا دینے سے کیا فائدہ۔ صاف اسی غار پر نشان لگا ہوا ہے۔ دائیں طرف سے سترھواں اور بائیں جانب سے دوسرا۔"

میں نے نقشے کو غور سے دیکھا اور میری سمجھ میں ایک بات آگئی۔ نقشے میں اس غار کو دو شاخہ دکھایا گیا تھا۔ شروع میں کافی دیر ہم اندھیرے میں چلے تھے اور دائیں طرف مڑ گئے تھے حالانکہ اصل میں ہمیں بائیں طرف جانا تھا۔ یہی حصہ زیادہ لمبا دکھایا گیا تھا۔

میں نے یہ بات دوسروں کو بتائی تو انھوں نے میرے خیال کی تصدیق کی اور پھر ہم واپس چلے۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ کوئی تیس گز چلنے کے بعد ہمیں ایک دو شاخہ ملا۔ اس بار ہم بائیں طرف والی سُرنگ میں داخل ہوئے۔ یہ زیادہ کشادہ تھی اور اس کی چھت بھی اونچی تھی۔ کئی سو گز چلنے کے بعد کچھ فاصلے پر لال لال روشنی سی دکھائی دی۔ پہلے تو ہم ڈر کر رک گئے لیکن پھر احتیاط سے آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ ذرا اور قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ایک بڑا سا گول سوراخ ہے جس میں سے روشنی کی کرنیں اندر آ رہی ہیں اور فرش پر پڑی ہوئی ریت چاندی کے ذرّوں کی طرح چمک رہی ہے۔

سب سے پہلے لارڈ جان سُوراخ کے پاس گئے اور پھر لپکا یک وہ چلّائے "چاند ـــ یہ چاند ہے۔ ہم نے سُرنگ کا دُوسرا سرا پا لیا ہے۔"

ہم سب لپک کر سُوراخ کے پاس پہنچے۔ سامنے پُورا چاند چمک رہا تھا۔ ہم نے جھانک کر دیکھا تو زمین زیادہ دُور نہیں تھی۔ یہاں سے نیچے پہنچانے کے لیے ہماری رسی کافی تھی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد ہم واپس آ گئے اور غار سے باہر نکلنے سے بہت پہلے اپنی مشعلیں بجھا دیں تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ اب ہمیں صرف اپنا سامان سمیٹنا تھا۔ اگلی رات کو یہاں سے نکل جانے کی بات پکی ہو چکی تھی۔

ہم نے اپنی روانگی کی تیاریاں اس احتیاط سے کیں کہ جنگلیوں کو ذرا شُبہ نہیں ہُوا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ بندُوقوں اور کارتُوسوں کے سوا کچھ بھی ساتھ نہ لے جائیں گے۔ لیکن چیلنجر اڑ گئے کہ اُن کا سامان ضرور جائے گا اور اُن کے سامان میں ایک بکس بھی تھا جس کے بارے میں مَیں ابھی نہیں بتاؤں گا کہ اس میں کیا کیا تھا۔ یہ بکس اتنا وزنی تھا کہ اُس نے ہمیں تھکا مارا۔ ہم اپنے ساتھ دو مضبوط بانس لائے تھے۔ سُرنگ کے باہر کے سرے سے ملا کر ہم نے ان بانسوں کو ایک چوکڑی کی شکل میں زمین میں مضبوطی سے گاڑا اور اُن میں رسّی باندھ دی۔ جس کے سہارے ایک ایک کر کے سب

لوگ اُتر گئے۔ چیلنجر کا سامان بھی اُسی میں باندھ کر اُتارا گیا اور آخر میں وہ خُود اُتر آئے۔

اپنی دُنیا میں واپس پہنچ کر ہمیں اتنی خوشی ہوئی کہ ہم نے کئی بار ایک دُوسرے سے ہاتھ ملایا اور مُبارک باد دی۔ اس کے بعد ہم زمبُو کے کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے لیکن جب رات کے آخری حصّے میں ہم وہاں پہنچے تو ہمیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہُوئی کہ وہاں ایک کے بدلے کئی الاؤ جل رہے ہیں۔ امدادی جماعت رسّیاں اور دُوسرا سامان لے کر پہنچ گئی تھی۔ گویا ہمیں یہ خُفیہ راستہ نہ ملتا تب بھی دُوسرے دن ہم نیچے اُتر سکتے تھے۔

یہاں پہنچ کر میں اپنی رپورٹ ختم کرتا ہُوں۔ آج ہم واپس روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ آخری قسط میں پارا پہنچ کر ڈاک میں ڈال دوں گا۔

واپسی

واپسی میں برازیل کی حکومت کے افسروں اور مقامی لوگوں کی طرف سے ہمیں جو مدد ملی اس کے لیے میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ پہلے قصبے میں پہنچنے کے بعد انھوں نے ہمارے لیے کپڑوں کا بندوبست کر دیا اور ہم ایک مرتبہ پھر مہذّب انسان نظر آنے لگے۔

ابھی ہم جہاز میں ہی تھے کہ مختلف اخباروں کے تار پر تار آنے لگے کہ ہم اپنا سفرنامہ اُن کے ہاتھ فروخت کر دیں لیکن جیسا کہ پہلے سے طے تھا یہ سفرنامہ میرے اخبار کے لیے مخصوص تھا اور اسے بھی اس کی اجازت نہیں تھی کہ ادارۂ حیوانیات کے ممبروں کے سامنے مشن پیش ہونے سے پہلے کوئی قسط چھاپی جائے۔

جب ہمارا جہاز ساؤتھمپٹن کی بندرگاہ پر پہنچا تو اخباری نمائندوں کی ایک فوج کی فوج ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی لیکن ہم طے کر چکے تھے کہ وقت سے پہلے زبان نہ کھولیں گے اس لیے وہ صرف ہماری تصویریں ہی کھینچ کر رہ گئے۔ ادارۂ حیوانیات کا جلسہ 7 نومبر کو

رکھا گیا تھا لیکن زولوجیکل ہال چھوٹا پڑ گیا۔ اس لیے جلسے کا انتظام کوئنز ہال میں کیا گیا۔ ہم 6 نومبر کو لندن پہنچے تھے گویا دوسرے ہی دن یہ جلسہ بلا لیا گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس جلسے کی روداد آپ کو کیسے سناؤں اور کہاں سے سناؤں۔ بہتر یہ ہے کہ میں اپنے اخبار کے 8 نومبر کے شمارے سے اس جلسے کی روداد ہی لکھ دوں۔ رپورٹ کی سرخیاں ہیں۔

نئی دنیا کی دریافت

کوئنز ہال میں عظیم الشان جلسہ

جلسے میں ہنگامہ۔ ریجنٹ سٹریٹ میں فساد

(ہمارے خاص رپورٹر کے قلم سے)

پروفیسر چیلنجر نے دعویٰ کیا تھا کہ پرانے زمانے کے جانور آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔ اُن کے اس دعوے کی تصدیق کے لیے پچھلے سال ادارۂ حیوانیات نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے پروفیسر چیلنجر کی گم شدہ دنیا کا سفر کیا اور آج رات کوئنز ہال میں اپنی رپورٹ پیش کی۔

یہ جلسہ سائنس کی تاریخ کا ایک یادگار جلسہ تھا اس لیے کہ وہاں پر موجود لوگوں نے جو کچھ سنا اور دیکھا اُسے وہ زندگی بھر نہ بھول سکیں گے۔ جلسے میں شرکت کے ٹکٹ صرف ممبروں اور ان کے دوستوں کے لیے مخصوص تھے لیکن زیادہ سے زیادہ مردوں اور عورتوں نے کسی نہ کسی

طرح ٹکٹ حاصل کر لیے۔ جلسے کا وقت اگرچہ آٹھ بجے شب کا تھا لیکن اس سے بہت پہلے ہی نہ صرف ساری نشستیں بھر گئی تھیں بلکہ بہت سے لوگ کھڑے تھے۔

جن لوگوں کو اندر جانے کا موقع نہ ملا انھوں نے باہر توڑ پھوڑ شروع کر دی اور اچھا خاصا بلوہ ہو گیا جس میں کئی آدمی زخمی ہوئے۔ زخمیوں میں اپج ڈویژن کے انسپکٹر اسکوبل بھی شامل ہیں جن کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اس ہنگامے سے فائدہ اٹھا کر بہت سے لوگ ہلاّ کر کے بے ٹکٹ اندر گھس گئے۔

جلسے میں شرکت کے لیے نہ صرف برطانیہ کے تمام ممتاز سائنس دان آئے تھے بلکہ فرانس، جرمنی اور سویڈن تک کے سائنس دان وہاں موجود تھے۔

گم شدہ دنیا کے سفر سے آنے والے چاروں آدمی جب وہاں پہنچے تو لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑ رہے تھے۔ یہ چاروں کے چاروں بڑے ہشاش بشاش تھے اور سفر کی سختیوں کا ان پر کوئی اثر نظر نہ آتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ان کا رنگ ذرا کالا ہو گیا تھا۔

جلسے کی صدارت ڈیوک آف ڈرہم کر رہے تھے۔ انھوں نے اپنی مختصر تقریر میں کہا کہ تحقیقاتی کمیٹی کی طرف سے مسٹر سمرلی رپورٹ پیش کریں گے میں ان کے اور آپ کے درمیان زیادہ دیر حائل رہنا نہیں چاہتا البتہ اتنا ضرور کہوں گا کہ ان لوگوں کا سفر کامیاب رہا ہے اور اس دنیا میں اب بھی ایسے عجوبے پائے جاتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں بہت کم علم ہے۔

جب مسٹر سمرلی بولنے کھڑے ہوئے تو پہلے سے زیادہ شور اور ہنگامہ

ہوا۔ ہم ان کی تقریر الگ شائع کریں گے۔ مختصراً یہ کہ انھوں نے پہلے اپنے سفر کا مقصد بیان کیا اور پھر اپنے دوست پروفیسر چیلنجر سے معافی چاہی اس لیے کہ ان کے دعوے کو غلط کہنے والوں میں مسٹر سمرلی بھی شامل تھے۔

مسٹر سمرلی نے تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح میپل وہائیٹ لینڈ پہنچے اور وہاں کیسے کیسے حیرت ناک جانور دیکھنے میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ قدیم زمانے کے جن جانوروں کے بارے میں ہمیں کچھ معلومات ہیں وہ تو وہاں زندہ موجود تھے ہی لیکن ان کے علاوہ بہت سے ایسے جانور بھی تھے جن کے بارے میں سائنس کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔

مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ ہم نے وہاں گہرے اودے رنگ کا ایک سانپ دیکھا جو ۵۱ فٹ لمبا تھا۔ ایک اور جانور دیکھا جو اپنے بچوں کو دودھ پلاتا تھا اور رات کو جگنو کی طرح چمکتا تھا۔ اسی طرح ایک بڑا کالے رنگ کا بھونرا بھی وہاں ہوتا ہے۔ مقامی جنگلیوں کے کہنے کے مطابق اس کا کاٹا پانی نہیں مانگتا۔ مختلف قسم کے ڈینو سارز اور ٹیروڈکٹائل پرندوں کی تعداد وہاں بہت ہے۔ مسٹر میلون نے تو وہ جانور بھی دیکھا ہے جس کا خاکہ پروفیسر چیلنجر نے میپل وہائٹ کی خاکوں کی کتاب میں دکھایا تھا۔ مسٹر سمرلی نے ہاتھی سے بھی بڑے خونخوار مینڈکوں کے بارے میں بھی بتایا۔ پھر انھوں نے بن مانسوں کا ذکر کیا کہ وہ باقاعدہ بستی بسا کر اور جھونپڑیاں بنا کر رہتے تھے اور ڈنڈوں اور پتھروں سے لڑتے تھے۔

غرض مسٹر سمرلی نے بڑی تفصیل سے ساری باتیں بتائیں۔ اس کے بعد مُبارک باد کی تجویز پیش ہُوئی۔ سویڈن کے سائنس دان اُس کی تائید کے لیے کھڑے ہی ہُوئے تھے کہ ایڈنبرا یونیورسٹی کے ڈاکٹر النگ ورتھ نے اُٹھ کر کہا۔

"جنابِ صدر، میں صرف وہی بات کہہ رہا ہُوں جو خود مسٹر سمرلی نے پچھلے جلسے میں کہی تھی۔ آخر ہمیں کیسے یقین آئے کہ یہ لوگ کوئی گھڑی ہُوئی کہانی نہیں سُنا رہے ہیں؟ مسٹر سمرلی کے پاس اپنے دعوے کا ثبوت کیا ہے؟"

اس تقریر پر بڑا ہنگامہ ہُوا۔ بہت سے لوگ ڈاکٹر النگ ورتھ کے حامی ہو گئے۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ "جنابِ صدر، بات صرف اتنی ہے کہ پہلے ایک آدمی جھوٹ بول رہا تھا اب چار آدمی وہی جھوٹ دُہرا رہے ہیں۔ آخر ہم بغیر کسی ثبوت کے اسے سچ کیسے مان لیں؟"

مجمع بے قابو ہُوا جا رہا تھا۔ ڈیوک آف ڈرہم امن و امان قائم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔ ڈاکٹر النگ ورتھ نے ان الفاظ پر اپنی تقریر ختم کی۔

"جنابِ صدر، میری تجویز یہ ہے کہ مسٹر سمرلی کا شُکریہ تو ادا کر دیا جائے لیکن اس کا اعلان کر دیا جائے کہ پروفیسر چیلنجر کے دعوے کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اور پھر تصدیق کے لیے ایک بڑی اور قابلِ اعتماد کمیٹی مقرر کی جائے۔"

مجمع بہت شور مچا رہا تھا۔ کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی کہ یکایک مکمل خاموشی چھا گئی۔ پروفیسر چیلنجر کھڑے ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے کہا۔

"آپ لوگوں میں سے جو لوگ پچھلے جلسے میں موجود تھے اُنھیں یاد ہو گا کہ اس قسم کی بدتمیزی کا مظاہرہ اس وقت بھی کیا گیا تھا۔ اس وقت سب سے زیادہ اعتراض مسٹر سمرلی کو تھا لیکن اب حقیقت ان پر عیاں ہو چکی ہے لہٰذا وہ میری تصدیق کر رہے ہیں۔

آج کے جلسے میں سب سے زیادہ اعتراض ان صاحب کو ہے جو ابھی تقریر کر کے بیٹھے ہیں۔ اگرچہ اُن کے اعتراض کا جواب دینے کے لیے مجھے اپنی اعلیٰ ذہنی سطح سے بہت نیچا آنا پڑے گا اس کے باوجود میں اس کے لیے تیار ہُوں تاکہ آپ میں سے جس کسی کے ذہن میں کوئی شک ہے تو وہ دُور ہو جائے۔"

اس پر لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ پروفیسر چیلنجر نے کچھ دیر رُکنے کے بعد پھر تقریر شروع کی۔

"مسٹر سمرلی نئی نئی قسم کے جو کیڑے مکوڑے اکٹھے کر کے لائے ہیں اُن سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ــــ"

ڈاکٹر النگ ورتھ نے بات کاٹ کر کہا۔ "ان سے کچھ نہیں ثابت ہوتا۔ کیڑے مکوڑے تو کہیں سے بھی لائے جا سکتے ہیں۔"

چیلنجر نے کہا۔ "اچھا، اگر آپ لوگ کیڑوں مکوڑوں سے قائل نہیں

ہوتے تو میں دیوزاد پرندے ٹیروڈکٹائل کی عادتوں کے بارے میں آپ کو بتاؤں۔ دیکھیے میرے پاس یہ کتاب ہے اس میں ٹیروڈکٹائل کی تصویر ہے۔"

"تصویر سے کام نہیں چلے گا۔" ڈاکٹر ڈارلنگ ورتھ نے کہا۔

"تم تو بہت ڈھیٹ ہو۔ تمہیں اگر زندہ ٹیروڈکٹائل بھی دکھا دیا جائے تب بھی تم نہیں مانو گے۔"

"کیوں نہیں مانوں گا، ضرور مانوں گا۔"

"سچ کہتے ہو؟"

"ہاں ہاں بھلا زندہ ٹیروڈکٹائل دیکھ کر کون انکار کرے گا۔"

ڈاکٹر ڈارلنگ ورتھ کا خیال تھا کہ انھوں نے پالا مار لیا ہے لیکن چیلنجر بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر سٹیج کے پچھلے دروازے سے ملے ہوئے کمرے میں گئے اور فوراً ہی واپس آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک طاقت ور حبشی ملازم تھا اور دونوں ایک بکس اٹھائے ہوئے تھے۔ بکس لا کر انھوں نے سٹیج پر رکھ دیا اور چیلنجر اس کا کھسکنے والا ڈھکنا کھول کر کہنے لگے۔

"چلو — نکلو باہر — شاباش۔"

لوگ اچک اچک کر دیکھنے لگے کہ اتنے بڑے بکس میں کیا ہے اور ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بہت بڑا اور انتہائی مکروہ صورت پرندہ پھڑپھڑاتا اور شور کرتا بکس سے نکل کر اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس کی سُرخ آنکھیں

انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور خوفناک لمبی چونچ میں سفید سفید نوکیلے دانتوں کی لمبی قطار دُور سے نظر آ رہی تھی۔

اُسے دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو گئے۔ عورتیں خوف سے چیخنے لگیں اور دو عورتیں تو بے ہوش ہو گئیں۔ پروفیسر چیلنجر ہاتھ ہلا کر مجمع کو سکون سے رہنے کی تلقین کرنے لگے لیکن اُن کا ہاتھ ہلانا غضب ہو گیا۔ دیوزاد پرندہ بھڑک گیا اچانک اُس نے اپنے بیس فٹ لمبے پر کھولے اور ایک جست بھر کر ہال میں چکر لگانے لگا۔ بجلی کی روشنی میں اس کے پر دار چمڑے کے پر اور بھی بھیانک نظر آ رہے تھے۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ گرتے پڑتے سب بھاگنے لگے۔ کئی آدمی کچلے گئے۔

ہال کی پچھلی دیوار کے اُوپر کے حصّے میں، چھت کے پاس، ایک بہت بڑا روشندان تھا۔ چیلنجر چیخے: "روشندان بند کر دو — بند کر دو۔" مگر وہاں سننے کا ہوش کسے تھا۔ دیوزاد پرندہ اڑتا اڑتا روشندان کے پاس آیا اور دونوں پر سمیٹ کر اس میں سے نکل گیا۔

اُس کے چلے جانے کے بعد لوگوں کو ہوش آیا۔ بھاگنے والے پلٹ پڑے۔ انھوں نے چاروں ہیروؤں کو کندھوں پر اٹھا لیا اور جلوس کی شکل میں لے چلے۔ لندن کی ساری سڑکوں پر جلوس نے گشت لگایا۔ کوئی ایک لاکھ لوگ اس میں شریک تھے۔ سارے شہر میں ٹریفک رک گیا۔ پولیس بھی لوگوں کے جوش و خروش کے سامنے بے بس تھی۔ آخر آدھی رات کے بعد جب لوگ تھک گئے تب کہیں جا کر

انھوں نے ان لوگوں کو چھوڑا۔

یہ تو تھی اس جلسے کی رپورٹ۔ اب اس ٹیرو ڈکٹائل کا قصہ سُنیے جو پروفیسر چیلنجر سے بے وفائی کر کے ہمیشہ کے لیے اُن کے دل پر داغ چھوڑ گیا۔ دو عورتوں نے گواہی دی کہ ہال سے نکل کر وہ پرندہ چھت پر بیٹھ گیا اور کئی گھنٹے بیٹھا رہا۔ دُوسرے دن شام کے اخباروں میں خبر تھی کہ مالبورو ہاؤس پر پہرا دینے والے ایک فوجی جوان کا کورٹ مارشل کر دیا گیا ہے کیونکہ وہ پہرا چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ اس بے چارے فوجی نے اپنی صفائی میں بتایا کہ میں نے ہوا میں ایک شیطان اُڑتا ہوا دیکھا تھا۔ وہ میرے اور چاند کے درمیان آگیا جس سے چاند بالکل چھپ گیا۔ یہ دیکھ کر میں اتنا ڈرا کہ بندوق چھوڑ کر بھاگ گیا۔

بحر اوقیانوس میں ہالینڈ کے ایک جہاز کے کپتان نے اپنی کتاب میں لکھا کہ صبح نو بجے ایک بہت بڑا پرندہ جہاز پر سے اُڑتا ہوا گزرا۔ اُس کا جسم بکری جیسا اور پر چمگادڑ کے سے تھے۔ اُسے جنوب مغرب کی طرف اُڑتے دیکھا گیا۔

تو گویا آخری گواہی کے مطابق چیلنجر کا یہ چہیتا پرندہ اپنے وطن کی طرف اُڑ رہا تھا۔ خدا جانے وہ وہاں پہنچا یا ہزاروں میل کے سفر کے درمیان ہی تھک کر سمندر میں گرا اور ختم ہو گیا۔

بچوں کے لیے دلچسپ ناول

ٹارزن	2.50	قزاقوں کی وادی	2.50	نانی پر کیا گزری؟
ٹارزن کی واپسی	2.50	شاہین اور دشمن درندے	2.50	پناکو کے کارنامے
ٹارزن اور درندے	2.50	قیدی	2.25	سلیم کی آپ بیتی
ٹارزن کا بیٹا	2.50	مریخ کا حملہ	1.25	محمود پر کیا بیتی
بادشاہ کا خواب پہلا حصہ	2.50	بونے اور دیو	2.50	خزانے کا راز
پراسرار جزیرہ دوسرا حصہ	2.50	گرہ کٹ	2.50	ایک بچہ ایک چور
نوشیرواں کی بیٹی تیسرا حصہ	2.50	نرگس	1.50	گوربلا
امیر حمزہ میدانِ جنگ میں چوتھا حصہ	2.50	اندھیرا غار	3.50	پانچ لاکھ
امیر حمزہ کوہ قاف میں	2.50	خون کی ہولی	2.50	سندربن کا خزانہ
کالا جزیرہ	1.75	چاندی کے چور	2.50	چھنگا ذیباں کے کارنامے
نورا	2.00	کشمیر کی بیٹی	1.50	ویران محل
خونی قلعہ	2.50	دو یتیم	2.50	رابنسن کروسو
چاند پر پہلا آدمی	2.50	مچھر کی سرگزشت	2.00	دشمن کی سازش
دنیا کا سفر	2.00	بارہ بھائی	2.00	شاہین کی واپسی
پراسرار آبدوز	2.00	وہ کیا راز تھا؟	1.75	سلیمانی خزانہ
ہاتھی دانت کے چور	2.50	بھوت بنگلہ	2.50	نیلا طوطا
دولت پور میں	3.00	غیبی انسان	2.00	سرکس کا ہاتھی
کیا وہ خواب تھا؟	1.25	میرا نام منگو ہے	2.50	ایک ٹانگ کا آدمی
خونی جزیرہ	1.50	شاہین محاذِ جنگ پر	1.50	کالا ناگ

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور • راولپنڈی • پشاور
منگلا • حیدرآباد • کراچی

سعید رضا سعید

معروف صحافی، اردو شاعر و ادیب، افسانہ و ناول نگار، مترجم شعبۂ خبر ریڈیو پاکستان کراچی۔
سابق چیف ایڈیٹر روزنامہ ہندوستان، بمبئی

ناول: ایک کہانی۔ تین عورتیں ایک مرد
خاوند: منور سلطانہ (شاعرہ و ادیبہ)
ولادت: جولائی ۱۹۲۹ء اجمیر
وفات: ۲۱ رجولائی ۱۹۹۵ء لاس اینجلس (امریکہ)
ماخذ: پ ک م س۔ سو مشہور شعراء جلد ۸

سعید شیخ

معروف اردو شاعر و ادیب۔
بانی مدیر ماہنامہ علامت لاہور (اجراء ۱۹۸۹ء)۔
۱۹۸۲ء میں بطور ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل ریٹائر ہوئے۔

ولادت: ۱۹۲۲ء
وفات: ۷ ار دسمبر ۲۰۰۳ء لاہور
تدفین: لاہور
ماخذ: نوائے وقت لاہور ۱۸ ردسمبر ۲۰۰۳ء

تدفین: موضع سوہال ضلع جہلم
ماخذ: نوشاہی شعراء

سعید ہالائی (ڈاکٹر محمد سعید ابڑو)

سندھی شاعر تلمیذ انور ہالائی

ولدیت: قاضی عبدالحئی سلیم
ولادت: ۱۸ ردسمبر ۱۹۲۵ء ہالہ
وفات: ۱۸ رمئی ۱۹۸۵ء ہالہ
تدفین: ہالہ ضلع حیدر آباد
ماخذ: دُر نایاب عرف یاور فتگاں

سعیدہ احسن

اردو ادیبہ، افسانہ نگار۔ مدیرہ ماہنامہ بتول لاہور۔ رسالہ قندیل لاہور میں ساحرہ کے قلمی نام سے افسانے لکھتی رہیں۔ اسلامی اقدار کے فروغ کے لئے قلم سے کام لیا۔

کتب: شہرت کا شوق۔ عید کا جوڑا۔
ساحرہ کے افسانے (۲۰۰۷ء)
دختر: مولانا ظفر اقبال مرحوم
وفات: ۲۴ ردسمبر ۲۰۰۶ء لاہور

وفیاتِ اہلِ قلم

رخصت ہو جانے والے پاکستانی اہلِ قلم کے کوائف اور تواریخِ وفات

۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء تا ۱۴ر اگست ۲۰۰۷ء



ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ

اکادمی ادبیات پاکستان



سعید رضا سعید

ساحر چلا گیا، سحر باقی ہے

لوگ کہتے ہیں نام کا شخصیت پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ان کے تخلص "ساحر" نے انہیں الفاظ و جذبات نگاری کی جادوگری سکھائی اور ایک مسحور کن شخصیت عطا کر دی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ان کی شخصیت نے اس لفظ کو نئے ہمہ گیر معنی دیئے۔ اس سے پہلے ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ ساحر کہتے کسے ہیں۔

چھریرا جسم، لمبا قد۔ اگر کرکٹ کی دنیا میں آ جاتا تو فاسٹ بالر بن کر ابھرتا۔ انگلینڈ ہوتا تو چار سو میٹر کا ریکارڈ اسی کا ہوتا۔ جس عالم میں کہ وہ بسنے والا تھا وہاں پولیس میں بھرتی کرنے والی ٹیم فیتے لئے امیدواروں کے قد ناپتی پھرتی تھی۔ فوراً لے لیا جاتا اور چونکہ پڑھا لکھا بھی تھا اس لئے ایس پی ہو کر ریٹائرڈ ہوتا۔ لیکن وہ بڑا نکما نکلا۔ شاعری جیسی فضول علت میں پڑ گیا اور مزید خرابی یہ کہ کمیونسٹ بن گیا۔ ساحر کے باشعور ہونے کا زمانہ وہ تھا جب دوسری جنگ عظیم نئی نئی ختم ہوئی تھی اور اگر خاندان کا کوئی لڑکا امن کی اپیل پر دستخط کر دیتا تو رشتے دار اور قریبی عزیز اسے پرسا دینے اور صبر کی تلقین کرنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

ہندوستان پر برطانیہ کی عملداری تھی۔ جنگ میں چونکہ سوویت یونین بھی اتحادیوں کا حلیف

شروع شروع میں ناکامیاں ہوئیں۔ ایک آدھ چانس مل جاتا تو پیسے نہیں ملتے۔ ساحر نے بہت سخت دن گزارے۔ لیکن حالات کی سختیاں اس دبلے پتلے نوجوان کو توڑ نہیں سکیں۔ اور پھر برف ٹوٹی۔ ساحر کے گیت ہندوستان کے چوٹی کے گلوکاروں کی آواز میں گلی گلی گونجنے لگے۔ اس وقت تک فلمی گانوں کے ریکارڈوں پر فلم، گلوکار اور موسیقار کا نام ہوتا تھا۔ شاعر کا نام دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ نہ پہلے کسی شاعر کو یہ مطالبہ کرنے کی جرأت ہوئی تھی۔ ساحر نے اپنے معاہدے میں یہ شرط لکھوانا شروع کی۔ شاعر کا نام ریکارڈوں پر بھی آنے لگا اور ریڈیو پر گانے سے پہلے اعلان میں بھی شاعر کا نام دیا جانے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلم انڈسٹری میں شاعروں کو باعزت مقام دلوانے کا سہرا ساحر کے ہاتھ ہے۔

ساحر کمٹمنٹ کے شاعر تھے کمٹمنٹ کے شاعر ہونے کے دعوے دار تو اور لوگ بھی ہیں لیکن ساحر وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے کبھی اپنے عہد سے دغا نہیں کی۔ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ کسی فلمساز کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان سے اپنا لہجہ بدلنے کو کہے۔

ساحر نے زندگی میں جتنا بھی کلام کہا اس کا بیشتر حصہ فلم میں لے لیا گیا۔ بہت طویل نظموں کے بھی بعض حصے فلموں میں آئے۔ فی گانا انہوں نے جو معاوضہ لیا وہ کسی دوسرے کو نصیب نہ ہوا۔

ساحر کی زندگی میں یوں تو بے شمار گانے مقبولیت کا بلند ترین افق پار کر گئے لیکن رمیش سہگل کی فلم "پھر صبح ہوگی" کا تھیم سانگ۔

وہ صبح کبھی تو آئے گی۔

دنیا بھر کے مظلوموں کا ترجمان اور ایک حیثیت سے محنت کشوں کا ترانہ بن کر جاوید ہو گیا۔ رمیش سہگل ترقی پسند تھے۔ ساحر کو لینے کے لئے انہیں اپنے پارٹنر سے لڑائی لڑنی پڑی اور ایک غیر معروف میوزک ڈائریکٹر کو لے لیا۔ پنجاب کے دو مسلمان لڑکے میوزک ڈائریکٹر بننے کے شوق میں آئے تھے۔ اس زمانے میں یہ رواج چل پڑا تھا کہ دو آدمی مل کر میوزک دیتے تھے چنانچہ حسن لال بھگت رام کا طوطی بول رہا تھا۔ ان لڑکوں نے 'ورما جی شرما جی' کے نام سے کوشش شروع کی۔ فلمسٹار نرگس کے بھائی کی ایک فلم میں انہیں چانس بھی ملا لیکن فلم ہر لحاظ سے کمزور رہی اور ورما جی شرما جی چمک نہ سکے۔

مسلسل ناکامیوں اور فاقوں سے گھبرا کر ورما جی تو واپس لاہور آگئے لیکن شرما جی نے جدوجہد جاری رکھی۔ رمیش سہگل نے اپنی فلم "پھر صبح ہوگی" کی موسیقی شرما جی کو دی اور ان کا نیا نام 'خیام' بھی خود ہی تجویز کیا۔ اس فلم کے گانے ہٹ ہوتے اور خیام راتوں رات نوشاد چتلکر اور دوسرے بڑے موسیقاروں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس فلم نے ساحر کے مقام کو بھی بے مثل استحکام بخشا۔

اقبال کے مشہور ترانے۔

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔

کی پیروڈی ساحر نے ایسی لکھی کہ پیروڈی کی صنف میں اسے ہمیشہ کے لئے ایک منفرد مقام حاصل ہو گیا۔ خیام نے اس کی دھن بھی ایسی بنائی کہ اسے کورس میں آسانی سے گایا جا سکتا تھا اور آج تک یہ ہندوستان میں بے روزگار اور بے گھر نوجوانوں کے ترانے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ساحر نے لکھا۔

چین و عرب ہمارا، ہے ہندوستاں ہمارا

تھا بلکہ پوری جنگ کا آدھے سے زیادہ دباؤ خود برداشت کر رہا تھا اس لئے اس کے خلاف سرکاری پالیسی میں قدرے نرمی ہوئی۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کو چھوٹ ملی۔ ساری دنیا میں یہ ایک اصول ہے کہ جتنے بھی زیادہ اچھے ادیب اور شاعر ہوتے ہیں ان کی بڑی اکثریت ترقی پسند بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ سچا فن کار حساس اور ایماندار ہوتا ہے۔ وہ مظلوموں کا دکھ درد محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر انسان کی فطرت کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہوتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا خاصا بڑا حصہ اچھے ادب میں شامل ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت میں لکھی جانے والی ایک بھی تحریر آج تک اچھے ادب میں شامل نہ ہو سکی۔

ہندوستان کا سرمایہ دار در پردہ فاشی محوری طاقتوں کا حامی تھا۔ یہ لوگ ہٹلر کو اپنے نجات دہندہ کے بطور دیکھتے تھے اور ہندوستان میں جے پرکاش نرائن کی سوشلسٹ پارٹی اور سبھاش چندر بوس کی بھی یہی پالیسی تھی۔ ہٹلر کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے جے پرکاش نرائن نے پورے ہندوستان میں دہشت گردی شروع کر دی اور سبھاش چندر بوس نے جاپانیوں کی سرپرستی میں آزاد ہند فوج بنائی۔ لیکن ترقی پسندوں نے اسے حب الوطنی کی جنگ عظیم قرار دیا۔ دنیا کی پہلی سوشلسٹ ریاست سوویت یونین کا کامیاب دفاع انسانیت اور حق و انصاف کی بقا کا مسئلہ بن گیا تھا۔

ہندوستان کے ترقی پسند بھی اپنا فرض بڑے خلوص سے نبھا رہے تھے۔ تحریک بڑی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ نئے لکھنے والوں میں بیشتر اسی طرف آ جاتے تھے۔ ساحر بھی پنجاب سے چلے، دہلی میں ٹھیکا لیتے ہوئے بمبئی آ گئے۔ بمبئی ہندوستان کا سیاسی مرکز تھا۔ ساری بڑی سیاسی جماعتوں کے ہیڈ کوارٹرز بمبئی ہی میں تھے۔ بمبئی کا پریس بڑا طاقت ور تھا۔ یہاں فلم انڈسٹری بھی موجود تھی جو ابلاغ کا بہت موثر ذریعہ تھا۔

جگر صاحب جب بھی کسی آل انڈیا مشاعرے کے سلسلے میں بمبئی آتے تھے، اپنے کسی ہونہار شاگرد کو ساتھ لاتے اور فلم انڈسٹری میں متعارف کرا کے چلے جایا کرتے تھے۔ شکیل مرادآبادی اور مجروح سلطان پوری کو بھی جگر صاحب نے دریافت کیا تھا اور انہوں نے پرانے جمے ہوئے شاعروں مدھوک، قمر جلال آبادی وغیرہ کی فصیلوں میں رخنے ڈالنے شروع کر دیئے تھے۔

ساحر بمبئی آئے تو انہیں جگر صاحب جیسی کسی بیساکھی کا سہارا نصیب نہیں تھا۔ وہ اپنی ہی پتلی پتلی ٹانگوں پر چلتے ہوئے داخل ہوئے۔ فلم انڈسٹری سرمایہ داروں کے ہاتھ میں تھی۔ شکیل انہیں سوٹ کرتے تھے۔ مجروح ہوشیار آدمی تھے۔ باغبان اور صیاد دونوں کو خوش رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ہم لوگوں کے ساتھ سیاسی مشاعروں میں آتے تو یہ پڑھ کر داد سمیٹتے ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے تھے کارواں بنتا گیا۔

اور فلموں میں اس قسم کے گیت لکھ کر پیسے سمیٹتے۔

ع
نجریا لاگی راجہ تورے بنگلے پہ۔

لیکن اس قسم کی سمجھوتے بازی ساحر کی فطرت کے خلاف تھی۔ کیمونسٹ ہونے کا لیبل ان پر لگ چکا تھا اس لئے کہ انہوں نے کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کی اور مارواڑی اور گجراتی فلم پروڈیوسر اس لفظ سے ایسے بدکتے تھے جیسے لال کپڑے سے بیل۔

رہنے کو گھر نہیں ہے ، سارا جہاں ہمارا
جتنی بھی بلڈنگیں تھیں سیٹھوں نے بانٹ لی ہیں
سڑکوں پہ پھر رہا ہے اب کارواں ہمارا ۔

ان کی نظم :

جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں "ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں"

ایک مقبول فلمی گانا ثابت ہوا حالانکہ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی زبان بہت مشکل ہے۔ کسی دوسرے فلمی شاعر کو اتنی ثقیل زبان استعمال کرنے کی جرأت کبھی نہیں ہوئی لیکن یہ نظم وہ پہلے کہہ چکے تھے۔ فلم کے لئے بعد میں اس کا انتخاب کیا گیا۔

ساحر بہت کماتے تھے اور بہت خرچ کرتے تھے۔ تار دیو پر ان کا بنگلہ ان ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے لئے سرائے بنا رہتا تھا جو فلم میں قسمت آزمائی کے لئے بمبئی کا رخ کرتے تھے۔ ماں جی (ساحر کی والدہ) ہر ایک کا خیال رکھتیں۔ کوئی بیمار ہوتا تو جاگ کر اس کی تیمار داری کرتیں۔ مادرانہ شفقت کا جو خزانہ ان کے پاس تھا وہ خالی ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔

بڑے سیاسی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کے لئے ساحر جب وعدہ کر لیتے تو ایسا کبھی نہ ہوتا کہ لوگوں کو مایوس کریں۔ وہ اسٹیج کے شاعر نہ تھے یعنی پڑھنے کا انداز ڈرامائی نہ تھا لیکن لوگ بڑی توجہ سے انہیں سنتے۔ کالجوں کی لڑکیاں اور لڑکے تو ان کے دیوانے تھے۔ ان کا مجموعہ تلخیاں ہندی میں بعد میں شائع ہوا لیکن اردو کا مجموعہ بھی ایسے طالب علموں نے خریدا جو اردو پڑھ نہیں سکتے تھے اور کسی دوست سے پڑھوا کر سنتے تھے۔

ساحر ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور کم سخن تھے۔ دھیمے لہجے میں بات کرتے تھے تنہائی پسند تھے۔ شرمیلے تھے۔ انہیں زندگی میں سب کچھ حاصل ہوا : دولت، شہرت، مقبولیت اور محبت۔ لیکن بدقسمتی سے وہ شادی نہ کر سکے۔ ان کے نام سے کئی رومان منسوب ہوئے۔ ایک مشہور گلوکارہ اور ایک مشہور ادیبہ اور شاعرہ کے نام سر فہرست ہیں لیکن کوئی رومان پروان نہ چڑھ سکا۔ ماں جی کو اس بات کا بڑا دکھ تھا۔

ساحر کے کردار کا سب سے بڑا کرشمہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کا کوئی دشمن نہ تھا۔ دراصل وہ اتنا پیارا آدمی تھا کہ کوئی زیادہ دنوں تک اس سے ناراض رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس سلسلے میں میرا ذاتی واقعہ ہے۔

میں روزنامہ ہندوستان ، بمبئی کا چیف ایڈیٹر ہونے کے علاوہ ایک ذاتی پرچہ " ہفتہ وار بمبئی " بھی نکالتا تھا جو روزنامے کے سائز پر اور اسی انداز میں شائع ہوتا تھا۔ یہ اگرچہ میرا ذاتی پرچہ تھا لیکن پڑھنے والے اسے پارٹی آرگن تصور کرتے تھے۔ یہ پرچہ اتوار کو پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ میں اس کی خبروں والی کاپی کی پیسٹنگ کر رہا تھا۔ دل بہت ملول تھا اس لئے کہ اسٹالن کی وفات کی خبر آ چکی تھی۔ میں نے حتی الامکان اس موضوع پر خاصہ میٹر بھی دیا تھا کہ کیفی اعظمی دوڑے ہوئے آئے اور کہا کہ اعلان کر دو کہ اگلا شمارہ " اسٹالن نمبر " ہوگا۔ صفحے بھی زیادہ ہوں گے اور اس میں ہم سب لکھیں گے۔ عام ہاکروں کے علاوہ ہم لوگ رضاکار بن کر بھی اسے سڑکوں پر فروخت کریں گے۔

میں نے کہا کہ اس میں لکھے گا کون۔ تم لوگوں کے دعوے میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔ کیفی نے پورا یقین دلایا بلکہ خود اعلان لکھ کر دے دیا جس میں حسب ذیل نام شامل تھے۔

کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، سردار جعفری، کیفی اعظمی وغیرہ ۔

میں احتجاج کرتا رہ گیا لیکن کیفی نے اعلان کاتب کو دے کر دو کالمی چوکھٹا لکھوایا اور ذمہ داری لی کہ وہ خود سب سے بات کر چکے ہیں اور سب کی تحریریں فراہم کریں گے۔

اور ہوا وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ مجروحؔ نے اپنی مطبوعہ کتاب میں سے ایک غزل دے دی اور ایک نظم کیفی اپنی دے گئے۔ باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

لیکن میں تو اپنے قارئین کے سامنے جواب دہ تھا۔ میں نے دو اہم ترین ناموں یعنی کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے نام سے اسٹالن کی وفات پر خود مضمون لکھے اور چھاپ دیئے۔ نہ صرف یہ کہ کسی نے بھی محسوس نہیں کیا بلکہ بعد میں کرشن اور عصمت دونوں نے ان مضامین کی تعریف بھی کی اور کسی نے بھی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ جن لوگوں نے مجھے 'لٹ ڈاؤن' کیا تھا ان سے مجھے بجا طور پر ناراضگی تھی۔ چیمبری (بمبئی کے قریب حصہ) کے مشاعرے میں ساحر ملے۔ پیشتر اس کے کہ میں کچھ کہتا، آ کر لپٹ گئے اور اس خلوص کے ساتھ "یار سوری" کہا کہ میرے دل کا سارا بخار نکل گیا۔ واقعی ساحر سے کوئی روٹھا ہوا نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ جانے پھر کیوں ایسا پیارا شخص ہم سب سے روٹھ کر چلا گیا؟۔

